جلد ۹۵ جون ۱۹۸۱ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

کی

اوّلین تصنیف

الجہاد فی الاسلام

○ جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔
● جس کی علامہ اقبالؒ نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔
○ جسے تحریکِ قیامِ پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔
● اِسلام کے نظریۂ جہاد اور قانونِ صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
○ دیگر مذاہب و اقوامِ عالم کے جنگی مقاصد و نظریات۔

اور

● بین الاقوامی قوانینِ قتال کا تقابلی مطالعہ
○ اسلامی قواعدِ جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل
● جہاد کے مخالفین و معترضین کا مُسکت جواب
○ درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

۶۰۰ صفحات ○ قیمت : ۳۶ روپے

اِدارہ ترجُمان القرآن
اچھرہ ○ لاہور

جون ۱۹۸۱ء ترجمان القرآن لاہور رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

فہرست مضامین

جلد ۹۵ | جون ۱۹۸۱ء مطابق شعبان ۱۴۰۱ھ | عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زرسالانہ تیس روپے۔ فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

حضرت شیخ الازہر پاکستان تشریف لائے تو ایک بیش قیمت نکتہ عطا فرما گئے ـــــ یہ کہ اسلام کی نگاہ میں چونکہ پوری ملّت یا اُمت ایک ہے، اس وجہ سے پارٹیوں کے وجود کا کوئی جواز نہیں۔ اِس ارشاد میں ایک بڑا جھول ہے۔ یعنی مطلوب تو یہی ہے کہ ملّت بالکل یک رُخ اور یک جان ہو، مگر موجود یہ حالت نہیں ہے۔ اگر معیاری ملّی وحدت کو موجود فرض کر کے احکام لگائے جائیں تو عالم عربی کا دوسروں سے الگ طور پر وجود رکھنا غلط ہوگا، اور عرب لیگ قائم کرنے کا کوئی جواز نہ ہوگا۔ مسلمانوں کی مختلف اقوام اپنی جداگانہ قومیتیں وضع کر کے الگ الگ جغرافی حدبندیوں میں نہ رہ سکیں گی اور دُنیا میں چالیس سے زیادہ مسلمان حکومتوں کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔ ابھی برادریوں، فرقوں، طبقوں اور پیشوں کی تقسیم باقی ہے۔ یہ ساری تقسیمیں جو وحدتِ ملّت کے تصوّر سے ٹکراتی ہیں، موجود ہیں اور شیخ ازہر نے ان کے متعلق کوئی اشارہ نہیں فرمایا۔ آخر فقط ایک سیاسی پارٹیوں کا امتناع کیوں؟

سیاسی نتائج کے لحاظ سے یک حزبی اور لاحزبی نظاموں میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ مطلب یہ کہ مثلاً حکمران کی پالیسیاں کوئی غلط رُخ اختیار کرتی ہیں تو کوئی حرکت انہیں روکنے کے لیے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ کون کس سے کہے اور لوگ کس کے گرد کس طرح جمع ہوں۔ وحدتِ ملت کے پردے میں دراصل فرد فرد بکھر جاتا ہے۔ ہر کوئی اپنی ذاتی دلچسپیوں اور مصیبتوں پر متوجہ ہے، کوئی بھی خصوصی طور پر سیاسی احوال پر نظر رکھنے اور اُن کا تجزیہ کرنے والی قوت موجود نہیں رہتی ـــــ

ـــــ دوسری طرف سے مخالف قوتیں اگر خفیہ اجتماعیت پیدا کر کے کوئی مضر سازشی نقشہ کا اختیار کر لیں تو اکثریت اُن کے سامنے

بے بس ہو گی۔

وسیع علاقوں میں پھیلی ہوئی کثیر التعداد آبادیوں میں سیاسی پارٹیاں جو خدمات انجام دیتی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔۔۔ وہ اپنی دعوت اپنی مطلوبہ عملی شرائط اور اپنے پروگرام کے ذریعے بکھرے ہوئے افراد کو نظم اور وحدت کے رشتے میں پرونے کا کام کرتی ہیں۔

۲۔۔۔ وہ ملکی اور غیر ملکی، سیاسی و معاشی مسائل پر تعلیم عوام کا کام کرتی ہیں۔

۳۔۔۔ وہ حکومت اور جمہور کے درمیان رابطے کا واسطہ بنتی ہیں، یعنی ایک طرف حکومت کے اقدامات اور پالیسیوں کی وضاحت قوم میں کرتی ہیں اور دوسری طرف قوم کے عوام کے پیچ در پیچ مسائل کا تجزیہ کر کے، بلکہ اُن کو متعین مطالبوں میں ڈھال کر حکومت کے سامنے رکھتی ہیں۔

۴۔۔۔ سیاسی پارٹیوں کا کام عوام میں سے صلاحیت اور کردار رکھنے والے خاص خاص افراد کو قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار کرتا رہتا ہے۔ ذہنی طور پر اعلیٰ درجے کا مطالعہ، فکری طور پر عملی مسائل کی سوجھ بوجھ، اخلاقی طور پر بااُصول اور دیانت دار ہونا، دعوتی طور پر ہر طرح کے لوگوں کے سامنے بار بار جا کر اُن کی مخالفتوں کا حسن استدلال سے مقابلہ کرنا۔ انتظامی طور پر بستی بستی سے لے کر اعلیٰ ترین سطح تک ہزاروں افراد کو ایک لڑی میں پروتے کی عظیم خدمت میں حصہ لینا اور سیاسی طور پر عوام اور حکمران دونوں کے سامنے کسی سیاسی جماعت کے چھوٹے اور بڑے قائدین کا یہ ثابت کر دینا کہ وہ دینی، قومی اور ملکی معاملات کو چلا سکتے ہیں۔ ان سارے پہلوؤں کو اگر دیکھا جائے تو ہر سیاسی جماعت قومی قیادت کی ایک نرسری ہوتی ہے۔ وہ قابلیت و کردار رکھنے والے غیر معروف لوگوں کو مختلف خدمات میں لگا کر انھیں آہستہ آہستہ نمایاں کرتی ہیں۔ یہ سارا کام اگر نہ کیا جائے اور ہر دفعہ عوام کے سامنے حکومت مردانِ مطلوب کی ایک فہرست منظوری کے لیے پیش کر دیا جائے (یا منظوری کے بغیر ہی ان کو لینے کا اعلان کر دے) یا عوام کے سامنے ہر مرتبہ نت نئے نامعلوم افراد انتخاب کے لیے نمودار ہو جاتے رہیں تو اس طرح نہ مناسب قیادت بن سکتی ہے اور نہ سیاسی استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ جو بیٹھے والا نہ حلقوں میں سے افراد کو چھانٹ کر سیاست کے کارجہانبانی میں لگانے کا تجربہ ہے۔ یہ بعض نظاموں میں پہلے بھی اپنے پورے معیار پر ہو چکا ہے۔ یہ "غیر سیاسی سیاست کار" بھی عجیب

چیز ہیں ۔ مثلاً ایک ڈاکٹر یا مصنف ہے جس نے کبھی عوام میں جا کر کام نہیں کیا، اُن کے سامنے کوئی نظریہ یا پروگرام پیش نہیں کیا ۔ اُن کے سامنے استدلال نہیں کیا، اُن کے سامنے اپنے کردار کو پرکھے جانے کے لیے نہیں رکھا ۔ اُن کے بدلتے حالات میں بار بار اُن کے احوال و مسائل کو نہیں سمجھا وہ ایوانِ حکومت میں جا کر کیا کرے گا ۔ اُس کے گرد عوام کی کوئی اجتماعیت ایسی نہیں ہے کہ وہ ہر مرحلے پر اپنے آدمیوں کو حکومت کی پالیسیوں اور اپنی کوششوں سے آگاہ کرے، اُسے حکومت کی غلطیوں پر گرفت کرنے کا تجربہ ہی نہیں ہے ۔ اس راہ میں جو سخت مقام آتے ہیں اُن سے وہ گزرا ہی نہیں ہے، تو وہ پہلے سے سوچے سمجھے کسی پروگرام اور منصوبے کے بغیر بجز اس کے کیا کرے گا کہ بعض جزوی فیصلوں کی حمایت کرے اور کسی بات میں دھیما سا اختلاف کرلے ۔ ایسے متفرق لوگوں کی ایک بھیڑ کو تو ایک فردِ حکمران بہترین طور پر استعمال کر سکتا ہے۔"

۵ ـــــ پارٹیوں کی وجہ سے سیاسی عمل میں ایک تسلسل قائم رہتا ہے ۔ کچھ اصول اور معیارات اور پروگرام پیچھے سے سامنے آتے ہیں اور آگے چلتے ہیں ۔ ایک پروگرام کا کچھ حصہ ایک دور میں جامۂ عمل پہنتا ہے تو اس کا بقیہ حصہ اگلے کسی دور میں ۔ نہ یہ کہ ایک قوت یکایک نمودار ہوئی جس کا کوئی ماضی نہیں، پھر وہ بغیر کوئی مستقبل ورثے میں چھوڑے رخصت ہوگئی اور ایک نئی قوت میدان میں آکودی یا لا کھڑی کردی گئی ۔ سیاست جہاں کہیں اس طرح کی قلابازیاں کھاتی ہے، وہاں جمہوریت تو کیا پنپے گی معمولی درجے کا سیاسی شعور بھی پروان نہیں چڑھتا ۔ قوم کو بھیڑ بکریوں کے گلے کی طرح کوئی اِدھر ہانک لے جاتا ہے اور کوئی اُدھر ۔ بار بار سفر کا رُخ بدلتا ہے اور بیچاری بھیڑ بکریاں نسل در نسل آوارگی میں مبتلا رہتی ہیں ۔

۶ ـــــ سیاست اور سیاسی تبدیلیوں کو منضبط رکھنے اور عوام کو سرپھرے پن سے روکنے میں بھی پارٹیوں کا بڑا حصہ ہوتا ہے ۔ اگر کوئی ناپسندیدہ اُمور سامنے آتے ہیں تو اُن کے خلاف پیدا ہونے والے جذباتی ردِّ عمل کو سیاسی پارٹیاں اعتدال کی راہ پر ڈال دیتی ہیں، اُن کا طریق کار چونکہ بنیادی طور پر دستوری اور تفہیمی اور استدلالی ہوتا ہے ۔ اس لیے پہلے مرحلے میں وہ اُمورِ متعلقہ کی تشریح کے لیے جلسوں اور تقریروں اور پبلسٹی سے کام لیتی ہیں ۔ پھر نیچے کی مجالس شوریٰ یا مجالس عاملہ میں غور و خوض

ہوتا ہے۔ اس کے بعد اعلیٰ ترین مجلس تک معاملہ جاتا ہے۔ پھر اگر مخالفانہ اقدام کا فیصلہ بھی ہوتا ہے تو پہلے ہمیشہ ہلکے ہلکے طریقِ احتجاج سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر پُرامن مظاہروں کا دور آتا ہے اور قبل اس کے کہ بات آگے بڑھے، جمہوری حکومتوں کے سمجھ دار مدبرین گفت وشنید کرنے یا اس کے بغیر یا تو کسی مطالبے کو اُس کی مقبولیت کی بناء پر جُوں کا تُوں تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور اپنے فیصلوں میں ردّو بدل کر لیتے ہیں یا اس کے زیادہ اہم حصّے کو وہ قبول کر لیتے ہیں۔ یا پھر ایسا ہوتا ہے کہ ایوان میں مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے اور دونوں طرف کا استدلال بھی سامنے آجاتا ہے اور جذبات بھی واضح ہو جاتے ہیں۔

پارٹیوں کا یہ کام بڑا صبر آزما کام ہے۔ ایک طرف انہیں اپنے عوام میں زندگی و حرارت بھی باقی رکھنی ہوتی ہے کہ وہ معاملات سے بے تعلق یا جمود پسند یا مایوس نہ ہو جائیں۔ دوسری طرف ان کو انضباط میں بھی رکھنا ہوتا ہے تاکہ وہ سرپھرے پن میں مبتلا ہو کر امن و نظم کے لیے خطرہ نہ بن جائیں۔ اور خود اپنی قیادت کے سامنے منہ زور نہ ہو جائیں۔

۷۔ پارٹیاں مملکت کے مختلف سیاسی واحدوں اور صوبوں اور نسلوں کے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ وہ افتراق پیدا کرنے والے اسباب کو حکومت کے سامنے لا کر اُن کے ازالے کی کوشش کرتی ہیں۔ (اگر کوئی پارٹی علاقائی یا نسلی یا کسی اور طرح کے غیر صحت مندانہ اختلاف کی انتہائی شکل) پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ خود اپنے اندر خرابی رکھتی ہے۔ ایسی خرابیوں کا سدِّ باب کچھ تو سیاسی ضروریات کرتی ہیں۔ اور ایک حد سے آگے قانون اور انتظامیہ سے کام لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کی رُو سے ایسی افتراق انگیزی جرم ہونی چاہیے اور اس کے مطابق عملاً انسدادی کارروائیاں ہونی چاہئیں۔ اصولاً ایک اسلامی ریاست میں ایسی کسی افتراق انگیز پارٹی کا وجود قانوناً جائز ہی نہیں ہونا چاہیے۔ خود صحت مند پارٹیاں بھی ان کا زور توڑتی ہیں۔

۸۔ پارٹیاں انتخابات کے نازک موقعوں پر عوام کو مناسب اصول و معیار یا پروگراموں پر جمع کرتی ہیں۔ ورنہ ہر شخص کا مختلف مسائل میں ایک الگ نظریہ ہوگا۔ اور معیارِ انتخاب بھی جداگانہ۔ متذکرہ وجوہ سے اندرونے حقیقت پارٹیاں عوام کو حالتِ انتشار سے نظم کی طرف لاتی ہیں پہلے وہ عوام کو ۸، ۱۰ نظاموں میں لاتی ہیں، پھر ۴، ۶ اور آخر کو ۲ یا ۳ میں۔

یہ جو پارٹیوں کی کثرت کی وجہ سے بجائے خود پارٹیاں باعث انتشار معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پارٹیوں کی تعداد کی چھنٹائی کا جو عمل سیاست میں فطری طور پر واقع ہونا چاہیے اُسے نہیں ہونے دیا گیا۔ ورنہ انتخابی سیاست سے دو چار بار گذرنے کے بعد تدریجاً تعداد کم ہو کر مناسب سطح تک آجانی چاہیے۔ کچھ پارٹیاں تو اپنے ملتے جلتے پروگراموں کی وجہ سے انتخابات میں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور انہی عمل اُن کو تدریجاً ایک بنا دیتا ہے۔ کچھ پارٹیاں دو ایک تلخ تجربات سے گذرنے کے بعد خود سکڑنے لگتی ہیں۔ اور آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں۔

پارٹیوں کو بار بار توڑنے اور معطل کرتے رہنے سے سیاست کی فضا ساری خراب ہو جاتی ہے، اور عوام کی سیاسی تربیت اور اُن کو انفرادیت کے انتشار سے نکالنے اور قیادت کے اہل افراد کو مسلسل اُبھارتے رہنے کا کام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ پارٹیوں کے تنظیمی اور تربیتی عمل میں خلل ڈالنے سے وہ حالات پیدا ہوتے ہیں جن میں پارٹیاں اصل وجہ انتشار معلوم ہوتی ہیں اور پھر جو اُٹھتا ہے وہ پارٹیوں کے خلاف دل کھول کر ناوک اندازی کرتا ہے۔

وحدتِ ملت کا واسطہ دینے والے بتائیں کہ تمام فقہی مدارس ختم کر کے ایک ہی مکتب کیوں نہ تشکیل دیا جائے؟ تمام اخبارات اور رسائل کو ایک ہی فرم کے حوالے کر کے ایک ہی رنگ میں کیوں نہ چلایا جائے؟ تمام کاروباری تنظیموں کو ہٹا کر ایک ہی تنظیم کیوں نہ قائم کر دی جائے۔ تعلیم یا ادب یا رفاہِ عامہ کے لیے بہت سی انجمنوں کے بجائے ایک ہی انجمن کیوں نہ کام کرے؟ مدارس کے مختلف نظام ختم کر کے ایک ہی نظامِ مدارس کیوں نہ بنا دیا جائے؟ حکومت کے تمام محکمے ختم کر کے ایک ہی محکمہ کیوں نہ قائم کر دیا جائے؟ مختلف خاندانوں اور برادریوں کے ناموں کو خلافِ قانون قرار دے کر ایک ہی خاندان کیوں نہ قائم کر دیا جائے؟ دلیل تو ہر جگہ وہی رہے گی کہ اُمت چونکہ ایک ہے اس لیے اس کے اندر الگ الگ حد بندیاں یا اختلاف نہیں ہونے چاہئیں۔

اختلاف رہیں گے اور اگر وہ وجہ افتراق اور باعث نفرت نہ بنیں تو معاشرے کے لیے سامانِ زیبائش ہیں اور ان کے ہونے سے خدا کی یہ رحمت ہوتی ہے کہ مختلف معاملات کے مختلف پہلو اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں اور مختلف افراد اور گروہ مسابقت کی وجہ سے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔

۹ ــــــ اصل سمجھنے کی بات یہ ہے کہ پارٹیاں بنتی کس طرح ہیں؟ ایک شخص کہتا ہے کہ جمہوریت ہونی چاہیے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں، امیرالمومنین کو پورے اختیارات ہیں۔

اب ایک شکل یہ ہے کہ دونوں صرف اپنا اپنا خیال لے کے چپ بیٹھیں اور کوئی کسی سے کچھ نہ کہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ گفتگو میں، خطاب میں، تحریر میں اپنے خیال کو ظاہر کریں، خیال کو ظاہر کریں گے تو اسی خیال کے اور بھی حامی سامنے آئیں گے۔ اور فکری وحدت ان کو اور قریب لے آئے گی۔ وہ مل بیٹھیں گے۔ جب ایک سے دو ہوئے تو جماعت بن گئی۔ پھر وہ تین، چار، پانچ، دس ہوں گے ــــ پھر سو، ہزار، لاکھ ہوں گے۔ اسی طرح دوسرے مخالف خیال کی ہم آہنگی بہت سے لوگوں کو اکٹھا کر دے گی۔

اس عمل میں سوچنے کی آزادی، مل بیٹھنے کی آزادی (یا آزادیِ اجتماع) اور تنظیم کی آزادی شامل ہیں۔ آخران آزادیوں کو اگر اسلامی حدود مہیا کر دی گئی ہوں تو ان سے استفادہ کرنے میں کون سا قاعدہ حائل ہے۔ اگر سفید پگڑی باندھنے اور براؤن ٹوپی کے اوڑھنے کے اختلاف سے کوئی خطرہ نہیں تو جمہوریت کی حمایت و مخالفت کے اختلاف سے کیا خطرہ۔ آپ یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ دوسروں سے نفرت نہ کی جائے، گالیاں نہ دی جائیں، ٹکراؤ پیدا نہ کیا جائے۔ اور امن و نظم کو نقصان نہ پہنچایا جائے، لیکن مجرد اختلافی رجحانات پر جمع ہونا تو گناہ نہیں۔

یہ تو اچھی صورت ہے کہ دو ایسے پلیٹ فارم ہوں جن میں سے ہر ایک جمہوریت کے حق میں یا جمہوریت کے خلاف بھرپور دلائل دے اور بار بار عوام کے ذہن کی تربیت کرے، یہاں تک کہ جو خیال غالب ہو جائے گا وہ حالات پر اثر انداز ہوگا اور جو کمزور رہے گا، وہ اگر ختم نہ ہو جائے تو اس کے لیے آگے موقع موجود ہے کہ وہ کسی اور مرحلے پر اُبھر آئے۔

۱۰ ــــــ یہ مسائل ہمارے اں آزادی سے پہلے ہی زیر بحث آنے لگ گئے تھے اور بالآخر دو طرفہ بحثوں کا ماحصل یہ رہا کہ جدید تعلیم یافتہ اور دینی اور عوامی حلقوں کا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ پارٹیاں ہونی چاہییں۔ خود علما نے پارٹیوں کا ساتھ دیا۔ پارٹیاں تسلیم کرنے والے دستور کو مانا، پارٹیوں کے تحت انتخابات لڑے، پارٹیوں کے متحدہ محاذوں میں شرکت کی۔ اب یکایک چند افراد کا اُٹھ کر نصف صدی سے قائم شدہ اس اجماع کو توڑ پھوڑ کرنئے سرے سے بحث کے میدان

میں لاڈالنا قوم کے اندر ثباتِ فکری نہ رہنے دے گا۔ نیز کئی ایسے اجتماعی فیصلے جنہیں سیکولر ذہن ناپسند کرتا ہے وہ اسی دلیل سے توڑ دیے جائیں کہ آخر علماء نے بھی تو پارٹیوں کے متعلق ایک فیصل شدہ امر کو توڑ دیا۔

افسوس کہ کسی کو اس حقیقت نفس الامری کا احساس نہیں کہ آپ کسی ایوان یا کمرے میں بیٹھ کر اس معاملے میں کچھ بھی ارشاد فرمائیں اور جدید طبقوں اور عامۃ الناس سے دُور رہنے والے رسائل میں کیسے کیسے فتوے بھی دیتے رہیں، آپ پوری قوم کو اپنے طرزِ فکر پر متفق نہیں کر سکتے۔ موجودہ سناٹا عنقریب دُور ہوگا اور مختلف قوتیں کام کرنے نکلیں گی تو کوئی ایسی چیز نہ چل سکے گی، جسے محض ایک خاص گروہ ذریعۂ خیر و برکت سمجھتا ہو۔

اس وقت تو حال یہ ہے کہ جو مختصر سا گروہ لاحزبی تصور کا جھنڈا اُٹھائے ہوئے ہے وہ اپنی مجالس کو دوسرے خیال کے دینی لوگوں تک سے محفوظ رکھتا ہے۔ حالانکہ کام کرنے والے کوشش کیا کرتے ہیں کہ مخالف نقطۂ نظر کے لوگوں سے گھلیں ملیں، اُن کے سامنے اپنے طرزِ فکر کو رکھیں اور ان کی طرف سے مخالفانہ دلائل کو سن کر اُن کا وزن ملاحظہ کریں۔ یہ کلھیا میں گڑ پھوڑنے کا طریقہ، عوامی سیاست کا طریقہ نہیں ہے۔

آخر میں حضرت شیخ الازہر کے متاثرین سے یہ گذارش ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرے پر اس معنی میں "وحدت" کا اطلاق نہیں ہوتا جس معنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں معاشرے کی یک آہنگی و یک رنگی موجود تھی۔ عقاید، عبادات، تعلیم، اخلاق، انفاق، جہاد، طرزِ حکومت، نظامِ قانون و عدالت وغیرہ تمام اُمور میں فکر بھی ایک تھی اور عمل بھی ایک تھا۔ آج تو عقاید کا یہ عالم ہے کہ توحید سے لے کر الحاد تک ہر قسم کا ذہن پایا جاتا ہے۔ یقین کے بجائے شکوک کا غبار دلوں میں بھرا ہوا ہے۔ عبادات کا یہ حال ہے کہ اکثریت تارک صلوٰۃ ہے۔ اسی طرح اخلاق اور معاملات کی تشکیل دولت پرستانہ ذہن کے تحت ہوتی ہے۔ اب مسلمان سے اخوت کا معاملہ کرنے والا مسلمان کہیں کہیں ملے گا۔ سانپ بچھو کا سلوک کرنے والے زیادہ ہوں گے۔ آج ہمارے یہاں سیکولرازم کے مومن بھی ہیں اور شریعت کے علمبردار بھی۔ دنیوی لذات کے اسیر بھی ہیں اور آخرت کے پاسدار بھی، جمہوریت پسند بھی ہیں اور آمریت نواز بھی، اشتراکیت پرست (باقی بر صفحہ ۴۸)

اِسلام کی قوّتِ تسخیر

(پندرھویں صدی ہجری کے آغاز پر لمحۂ فکریہ)

جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم

آج سے چودہ صدیاں قبل عرب کے انتہائی پس ماندہ، ناخواندہ اور باہم دست و گریباں قبائلی معاشرہ میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دین اسلام یعنی اسلامی طرزِ زندگی کو پیش کیا۔ رسوم و رواج اور معاشرتی بندھنوں میں جکڑے بند لوگوں کے اندر نفرتوں، مخالفتوں اور عداوتوں کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا، جس کے نتیجے میں جنگ و جدل اور مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بتدریج مخالفتوں کے سارے بادل چھٹ گئے، مطلع صاف ہوگیا۔ دل کے دریچے اسلام کے لیے کھُل گئے۔ ۲۳ سال کی قلیل سی مدّت میں دینِ اسلام عربی معاشرہ کا نظامِ غالب بن گیا۔ پھر اہلِ عرب دینِ اسلام کو لے کر تسخیرِ عالم کی جانب متوجہ ہوئے تو حالت یہ تھی کہ علاقے کے علاقے اور قومیں کی قومیں اسلام کے آغوشِ عاطفت میں آگئیں۔ جو قوم اُن سے ٹکرائی شکست کھا گئی، جو قوم اُن سے متصادم ہوئی پاش پاش ہوگئی۔ اس دین کا نہ کوئی حریف رہا اور نہ کوئی مدِّمقابل۔

تاریخ کے صفحات پر یہاں ایک سوال اُبھرتا ہے کہ اسلام کے اندر وہ کون سی غیر معمولی قوّتِ تسخیر پنہاں ہے جس کی وجہ سے اس کو ہر قوم پر، ہر معاشرہ پر اور ہر نظامِ فکر پر غلبہ حاصل ہوتا رہا ہے۔ دانش مندوں کے لیے عقدہ کشائی کا اچھا موقع ہے۔ جدید دَور کے مفکرین اور مؤرخین اس عقدہ کشائی میں مدّتوں سے مغز ماری کر رہے ہیں۔ ہماری حیرت کی انتہا ہو جاتی ہے جب ہم پڑھتے ہیں کہ واٹرلو کی جنگ ۱۸۱۵ء میں شکست کھا جانے کے بعد نپولین جس وقت سینٹ ہلینا کے جزیرہ میں محصور تھا

اُس وقت بھی وہ اسلام کی سُرعتِ فتوحات پر غور کرتا ہے اور رشک کرتا نظر آتا ہے (یادداشت، فرانسیسی جلد ۲ ص ۱۸۳)

اسلام کی سرعتِ فتوحات کے اسباب معلوم کرنے میں ساری دشواری ہمارے ذہن کی پیدا کردہ ہے۔ آج کل ہمارے سوچنے کے انداز اور فکر کے زاویے بدل گئے ہیں۔ اس وجہ سے ہم اُس دور کے انسانوں کے احساسات اور جذبات کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ آج انسانیت کی سب سے بڑی مصیبت یورپ ہے۔ یورپ کے حکماء، دانشور اور مفکرین نے فکر و نظر کے قافلہ کو مادہ پرستی کے غلط راستہ پر ڈال دیا ہے۔ یورپ نے تمام دُنیا کے انسانوں کو گمراہ اور بدراہ کر دیا ہے۔ اہلِ مغرب انسان کو محض مادہ قرار دیتے ہیں۔ رُوح، ضمیر اور عقل کو بھی مادّہ کے ضمنی اور ذیلی نتائج قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے انسان کے اعمال اور افعال کے محرکات کو بھی مادی قرار دیا ہے۔ یعنی جبلتِ شہوت، جبلتِ شکم، نمود و خود نمائی اور ہم جنسوں پر غلبہ حاصل کرنا اُن کے خیال میں انسانی زندگی کے تمام اعمال و افعال کے محرکات ہیں۔ ظاہر ہے جب انسان مادّی ہو، جب اُس کے محرکاتِ عمل مادّی ہوں تو پھر انسانی زندگی کا سفر ٹھیک اسی سمت اور راہ پر ہوگا جہاں مغرب آج اس کو لے جا رہا ہے۔ اور پھر وہ ٹھیک اُسی گڑھے میں جا کر گرے گی، جہاں آج وہ گر رہی ہے۔ کسی روحانی رفعت اور اخلاقی بلند کرداری کا وہاں کیا مذکور ہو سکتا ہے۔

اسلام اہلِ مغرب کے برخلاف انسان کو روحانی مخلوق قرار دیتا ہے۔ مادّی جسم رُوح کو کاربرآری کے لیے عطا ہوا ہے۔ جسم کے گھوڑے پر رُوح سوار بنی ہے۔ حاکم رُوح ہے گھوڑا نہیں ہے۔ نقطۂ نظر کے اس عظیم الشان فرق کے بعد اسلام کی نگاہ میں انسانی زندگی کے اعمال و افعال کے محرکات بھی محض مادّی نہیں ہیں بلکہ اخلاقی اور رُوحانی ہیں۔ اس کے لیے کسی فلسفیانہ دقیقہ سنجی کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ انسان کی روزمرہ کی گفتگو کے دو چار جملے اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

دو افراد باہم لڑتے ہیں۔ ہر فرد کہتا ہے کہ یہ میرا حق ہے گویا دونوں کا مطلوب "حق" ہے

انسان جھوٹ بولتا ہے مگر کہتا ہے کہ یہ سچ ہے — گویا مطلوب "صدق" ہے۔

انسان کہتا ہے یہ چیز مجھے اچھی لگتی ہے — گویا مطلوب "حُسن" ہے۔

انسان کہتا ہے یہ بڑا بھلا آدمی ہے ـــ گویا مطلوب "خیر" ہے۔
انسان کہتا ہے یہاں مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔ گویا مطلوب "طمانیت" ہے۔
یہ عام آدمیوں کی گفتگو کے چند جملے ہیں۔ اِن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ اخلاقی قدروں کا طلب گار رہتا ہے۔ بہر طور اور بہر رنگ انسان اقدارِ حیات کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے انسانوں کی ساری جدوجہد ساری دوڑ دھوپ ہمیشہ اقدارِ حیات کے گرد گھومتی ہیں۔ اس کا کوئی قول اور فعل ان اقدارِ حیات کی تلاش اور جستجو سے خالی نہیں رہتا۔
بلاشبہ انسان مادی خواہشوں اور جبلی تقاضوں میں گھرا ہوا ہے جو اس کے حیوانی وجود کے تقاضے ہیں۔ مگر حقیقی انسان نہ جسم ہے اور نہ جبلی تقاضے۔ حقیقی انسان رُوح ہے اور رُوح کے تقاضے ہیں۔ انسان شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر حقیقت کبریٰ کا متلاشی رہتا ہے۔ حقیقتِ کبریٰ کے بہت سارے جلوے ہیں۔ وہ عظمت و جبروت ہے۔ وہ رفعت و کمال ہے، وہ استغناء و تقدس ہے، وہ حسن و جمال ہے، وہ حق و صداقت ہے، وہ خیر و فلاح ہے، وہ سکون و طمانیت ہے۔ اقدارِ عالیہ دراصل حقیقتِ کبریٰ کے پرتو ہیں۔ یہ اسمائے حُسنیٰ کی تجلیات ہیں۔ اقدارِ حیات مادی الاصل نہیں ہیں۔ یہ عقل اور تجربہ کی استنباط کردہ نہیں ہیں۔ یہ اکتسابی نہیں ہیں بلکہ ان کی طلب انسان میں ودلیعت کردہ ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے انسان کو مادی قرار دیا ہے، انہوں نے کس قدر گمراہی پھیلائی ہے۔ اُن کی فکر حقیقت سے کس قدر دُور ہے اور بدراہ ہے۔
جب یہ بات واضح ہو گئی کہ اقدارِ حیات کے حصول اور یافت میں افراد اور اقوام ساری عمر سرگرداں رہتی ہیں۔ انسانیت کا سفر اوّل روز سے اقدارِ حیات کی یافت کا سفر ہے تو اس بات کا سمجھنا آسان ہو گیا کہ انسان (افراد ہوں یا معاشرہ) ـــ صرف اسی نظامِ فکر و عمل کو دل سے قبول کرتا ہے۔ جس میں اقدارِ حیات کو ارفع مقام حاصل ہو۔ انسان جلد یا بدیر اس نظامِ فکر و عمل کے خلاف بغاوت کرتا ہے، جس میں اقدارِ حیات کا کوئی مقام نہ ہو۔
حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دین اسلام کے نام سے جو نظامِ حیات پیش کیا ہے۔ وہ ان اقدارِ حیات کے عین مطابق ہے۔ وہ فطرتِ انسانی کی تشنگی کی سیرابی

کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس میں جسم کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں اور روح کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے انسانی فطرت اور انسانی روح اس دین کو فوراً قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ فطرت جس قدر صاف اور بے داغ ہوتی ہے اُسی قدر وہ اس دین کو قبول کرنے میں پیش قدمی کرے گی۔

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسانی رُوح ایک مادّی جسم سے وابستہ ہے۔ مادی جسم ایک معاشرہ میں زندگی گذارتا ہے۔ معاشرہ درحقیقت ہزار ہا قسم کے روابط اور تمدنی پابندیوں کا نام ہے۔ معاشرتی انسان بہت ساری قیود میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔ داخلی اور خارجی بہت سارے موانعات اور تعصبات اُس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے انسان کو دینِ حق کے استقبال کرنے میں اور پیش قدمی کرنے میں دشواریاں اور مشکلات پیش آتی ہیں۔ اسی وجہ سے تذبذب اور تاخیر کا ایک دَور اُس پر گذرتا ہے۔ مگر جب حق کی قوتِ نافذہ موانعات اور تعصبات کے پردے چاک کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو رُوحِ انسانی اسلام کی جانب اس بے تابی سے لپکتی ہے جس طرح ایک پیاسا کنویں کی جانب لپکتا ہے۔ قبولیتِ اسلام کی راہ میں جو بھی رکاوٹیں ہیں، وہ دراصل تمدن اور معاشرت کے پیدا کردہ بندھن ہیں۔ فہم و ادراک، عزم و ارادہ کی قوتیں انسانوں میں متفاوت انداز میں تقسیم ہوئی ہیں۔ اس لیے ان بندھنوں کو توڑنے میں انسانوں کو مختلف انداز میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

ان معاشرتی بندھنوں اور تمدنی قیود کو توڑنے کے لیے ہی اسلام نے جہاد کو مشروع فرمایا ہے۔ مادہ پرست لوگ اسلام کے جہاد کی اصل غرض و غایت کی تہ تک رسائی حاصل نہ کر سکے اور اس کی مختلف تعبیریں شروع کر دیں۔ انہوں نے عام دُنیاداروں کے نقطۂ نظر سے اس کو بھی مال و متاع کی حرص قرار دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ:-

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اسلامی جہاد شہادتِ حق کی خاطر ہوتا ہے۔ اسلامی جہاد شہادت علی الناس کا اہم فریضہ ادا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح دینِ اسلام انسان کی فطری تشنگی کو سیراب کرتا ہے۔ اسلام

حق و صداقت ہے۔
اسلام کہتا ہے کہ اس کائنات کا خالق و مالک صرف ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اس کو ہزارہا اقسام کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ایک دن ضرور وہ ان نعمتوں کا حساب لے گا۔ اس لیے انسان کو ہدایت خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیے۔ یہ وہ حق و صداقت ہے جس کو انسانی فطرت آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں نے شرک و بت پرستی کا عقیدہ گھڑا ہے، اس کے قبول کرنے میں انسانی ذہن کو الجھنیں محسوس ہوتی ہیں۔ شرک اور توحید کی کشمکش میں بالآخر توحید کو فتح حاصل ہوتی ہے۔ اسلام نے دنیا میں خالص توحید کا عقیدہ پیش کیا۔ نظری اعتبار سے کوئی بھی شخص توحید کا رد نہیں کر سکا۔

اسلام سکون و طمانیت ہے۔
جب انسان اسلام کی حقانیت کو قبول کر لیتا ہے تو اس کی روح کو سکون اور طمانیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایمان باللہ انسان کے قلب و دماغ کو یکسوئی اور یک رنگی، سکون اور طمانیت کی دولت عطا کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی ہر قسم کے تضادات اور تناؤ سے پاک ہو جاتی ہے۔ قول و عمل میں توافق اور یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ توانائیوں کو جائز مصرف مل جاتا ہے۔ عمل کی جہت اور سمت مقرر ہو جاتی ہے۔ جس فرد اور جس معاشرہ کو یکسوئی اور طمانینت مل گئی اس کو گویا دولتِ کونین مل گئی۔ ابتدائی عہد کے صحابہ کرام اس نعمتِ بے بہا کے حامل تھے۔ ان کے مخالف کفار اور مشرکین اس دولت سے محروم تھے۔ مادی اسباب کی فراوانی اس محرومی کی تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ اس صورت میں جب بھی اہل حق کا اہلِ کفر سے مقابلہ ہوا، اہلِ حق کامیاب رہے۔ اہلِ کفر ان کی پُرسکون زندگیوں پر رشک کرتے تھے۔

اسلام رفعت و بے لوثی ہے

ایک دنیا دار کی نگاہ بہر حال خواہشات اور اغراض کے گرد گھومتی ہے۔ اس وجہ سے وہ تنگ نظر اور تنگ دل ہوتا ہے۔ ایمان باللہ مومن کا ذہنی افق وسیع تر کر دیتا ہے۔ اس کو مادی سطح سے بلند کر کے روحانی سطح پر پہنچا دیتا ہے۔ بظاہر ایک مومن بھی دنیا دار کی طرح کاموں میں

مشغولیت رکھتا ہے مگر بباطن وہ آخرت میں اجر و ثواب کا طلب گار رہتا ہے۔ وہ رضائے الٰہی کا خواہاں ہوتا ہے۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی نے اس کے دل و دماغ کی کیفیات کو تبدیل کر ڈالا۔ اس کے اندر وسعتِ قلب اور رفعتِ نگاہ اور بے لوثی کی صفاتِ عالیہ پیدا ہوجاتی ہیں۔ رزم گاہِ حیات میں جب بھی مخلص اور بے لوث جد و جہد کرنے والے افراد کا مقابلہ اغراض پرست تنگ دل افراد سے ہوا ہے۔ ہمیشہ مخلص افراد کے قدم کامیابی نے چومے ہیں۔ عہدِ اوّل کے مسلمان، جنت کے طلب گار، ربع مسکوں میں دینِ حق کا جھنڈا بلند کرتے تھے۔ دُنیادار مورخ ان کے دل کی گہرائیوں میں نہ جھانک سکے۔ اور غلط طور پر اُن کی جد و جہد کو بھی حرصِ متاع و جاہ سے تعبیر کیا۔

اسلام حسنِ اخلاق ہے

ایمان باللہ میں مطلوب و مقصود رضائے الٰہی ہوتا ہے، حصولِ مطلب کے لیے مومن ہر وہ کوشش اور ہر وہ جد و جہد کرتا ہے جو حسنِ عمل کے ذیل میں آتی ہے۔ ان تمام اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرتا ہے، جن سے بندہ کو قربِ خداوندی حاصل ہوتا ہے۔ صدق و اخلاص، دیانت و امانت، رحمت و شفقت، سعی و جہد کے صفاتِ حسنہ اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ اور کذب و افترا، خود غرضی و فریب، غیبت و بخل وغیرہ صفاتِ ذمیمہ سے اپنے آپ کو پاک رکھتا ہے۔ عہدِ اوّل کے مسلمان اخلاقِ حسنہ سے آراستہ تھے اور رذائل اخلاق سے دُور تھے۔ ہر حال میں خدا کی کبریائی کا اعلان کرنے والے خود ہر قسم کے نخوت و غرور سے مبرا تھے۔ ہر حال میں مخلوقِ خدا پر شفقت و مہربانی کرنے والے خود اجر و ثواب کی تمنا صرف رب تعالیٰ سے رکھتے تھے۔ جب دُنیا میں ہر جگہ اغراض پرستی اور زر پرستی کا چلن ہو، وہاں ایسے بے لوث خادمِ خلق اور مسکین طبع لوگ شبِ تاریک میں روشن ستاروں کی مانند چمکتے تھے۔ جس سرزمین میں گئے وہاں نمایاں ہوگئے۔ ان کے کردار میں مقناطیس کی کشش تھی۔ لوگ دُور دُور سے کھنچ کر اُن کی طرف آتے تھے۔ جو اُن کے قریب آیا وہ بس ان کا ہوگیا۔ افراد کا افراد سے اور معاشرہ کا معاشرہ سے جب تصادم ہوتا ہے تو بالآخر فتح حسنِ اخلاق اور حسنِ اعمال کی ہوتی ہے۔ اسی لیے مسلمان افراد اور مسلمان معاشرہ ہر جگہ فاتح اور کامیاب رہا۔

اسلام متوازن زندگی ہے

اسلام صرف عقیدہ اور اخلاق دینے پر اکتفا نہیں کرتا ہے۔ بلکہ وہ انسانوں کو زندگی بسر کرنے

کا بہترین طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، عملی نمونۂ زندگی اسلام کی صراطِ مستقیم ہے۔ یہی قانونِ شریعت ہے۔ یہ حد درجہ متوازن ہے اور حد درجہ معتدل ہے۔ اس میں جسم و جان کے مطالبے اور تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں اور اس میں روح اور اخلاق کے مطالبات بھی پورے ہوتے ہیں۔ اس میں ہر جہت اخلاق کو برتری حاصل ہے۔ اس کے برخلاف ذاتی فہم و فراست کے بل بوتے پر مفکرین اور فلاسفہ نے جب بھی کوئی معاشرہ تشکیل دیا ہے جب بھی کوئی شاہراہِ حیات تجویز کی ہے، وہاں ضرور کہیں نہ کہیں جھول پایا جاتا ہے۔ امتدادِ زمانہ سے ایسے نظاموں کی انتہا پسندی ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ نوعِ انسانی کے مستقبل کے امکانات اور حال کے مؤثرات و عوامل کا احاطہ کر لینا کسی انسانی عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔ عقل اس منصب رفیع کی اہل ہی نہیں ہے۔ ایسے انتہا پسند معاشروں میں صحابہ کرام متوازن اور معتدل حسنِ معیشت و حسنِ معاشرت کا نادر تحفہ لے کر گئے۔ لوگ اس پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اس نے لوگوں کے دل موہ لیے۔ دل کے دریچے اُن کے لیے وا ہو گئے۔

اسلامی خلافت خدمتِ خلق ہے:

اسلام سے قبل دُنیا میں ہر جگہ بادشاہت کا طریقہ رائج تھا۔ ہر مُلک اور ہر قوم بادشاہوں کی عیاشیوں اور ستم رانیوں کا مزہ چکھ رہی تھی۔ عوام الناس ان حکمرانوں کے ہاتھوں میں بے بس کھلونا تھے، جن کی نہ عزت محفوظ نہ آبرو۔ جن کے کوئی حقوق نہ تھے۔ اسلام نے ملوکیت کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ خلافت کا نظام رائج کیا۔ طریقۂ خلافت کے ذریعے اسلام نے درویشوں کو اور فقیروں کو تختِ شاہی پر لا کر بٹھا دیا تھا۔ ان کا رہنا سہنا عوام الناس کے برابر تھا۔ بیت المال سے ایک حبہ زائد لینا وہ حرام سمجھتے تھے۔ مُلکی معاملات میں بھی وہ اخلاق کے حد درجہ پابند تھے۔ قادسیہ کی جنگ میں ایک سپاہی نے ایرانی سپہ سالار کو امان دے دی تھی۔ خلیفہ نے اُس امان کو برقرار رکھا۔ حمص کی جنگ میں اسلامی فوج کو کسی مجبوری کی وجہ سے شہر کو خالی کرنا پڑا۔ فوراً جزیہ یعنی زرِ تحفظ، ذمیوں کو واپس کر دیا۔ دُنیا نے پہلی دفعہ قانون کی بالادستی اور معاہدات کی پابندی دیکھی۔ یہ خلفاء شریعت کے پابند تھے۔ اپنے طرزِ عمل کے لیے قانون کے سامنے جواب دہ تھے۔ بارہا قاضی کی عدالتوں میں پیش ہوئے ہیں۔ بلاشبہ ان خلفاء نے مُلکوں کو فتح کیا۔ مگر نہ مفتوح کا استحصال ہے۔

نہ تفوق و برتری ہے، بلکہ سختی سے انسانی حقوق کی پاسبانی ہے۔ عہدِ اول کے خلفاء اور مسلمانوں کی اس طرزِ حکومت کو دیکھ کر غیر مسلم اسلامی حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہود و نصاریٰ کو جس قدر تحفظ اور آرام اسلامی مملکتوں میں حاصل تھا، اتنا ان کی اپنی حکومتوں میں بھی حاصل نہیں تھا۔ اس لیے وہ مسلمانوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے۔

اسلام کی قوتِ تسخیر درحقیقت مسلمان افراد، مسلمان معاشرہ، اسلامی شریعت اور اسلامی خلافت کی اخلاقی اور عملی برتری تھی جو اُن کو غیر مسلموں پر حاصل تھی۔ یہ وہ ہمہ جہت کشش اور مقناطیسی قوت تھی جو انسانوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اُن کے دل اسلام کے لیے کھل جاتے تھے۔ ابتدائی صدیوں میں اسلامی معاشرہ پر اسلامی اخلاق اور اسلامی شریعت کا غلبہ رہا ہے۔ اس وقت تک اسلام کی قوتِ تسخیر بھی بے پناہ رہی ہے۔ کوئی اس کا نہ حریف تھا نہ مدِمقابل۔

آج پندرھویں صدی ہجری کے آغاز پر ہر سمجھدار آدمی کے سامنے یہ سوال ہے۔
اسلام کی شمشیر جگر دار اُڑا لی کس نے؟

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور "اسلامی تعلیمات"

جناب پروفیسر ثناء اللہ مجاہد

زندگی کے تمام امور، خصوصاً اجتماعیات میں کسی اقدام کے متعلق پہلے سے یہ سوچ لینا ضروری ہوتا ہے کہ ۱۔ اسے کرنا ہے یا نہیں کرنا ہے؟ ۲۔ اسے مؤثر انداز سے کرنا ہے یا ڈھیلے ڈھالے سرسری انداز سے؟ ۳۔ محض لوگوں کو خوش کرنا یا کسی خاص طبقے کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے، یا حقیقت میں اُس کا حق ادا کرنا؟ ۴۔ جو رکاوٹیں، مزاحمتیں اسے نقصان پہنچائیں، انہیں دور کرنا ہے یا اقدام بھی ہے اور رکاوٹوں کا بھی تحفظ کرنا ہے؟

یہی سوالات اسلامیات کی تعلیم کے متعلق بھی پیدا ہوتے ہیں اور ان کا کوئی واضح اور حتمی جواب ہونا چاہیے جو خود اقدامات کے انداز سے ظاہر ہو۔

اس سلسلے میں تعلیمی اکابر اور حکمران قوت کے لیے یہ مختصر پُر خلوص مضمون ایک لمحۂ فکریہ مہیا کرتا ہے۔ اسی اہمیت کی وجہ سے ہم اسے شائع کر رہے ہیں۔ درآنحالیکہ فوٹو سٹیٹ کاپی ملنے کی وجہ سے اس کی نوعیت ایک مراسلے کی ہوگئی ہے جسے ممکن ہے کہ کئی جگہوں پر اشاعت کے لیے بھیجا گیا ہو۔ بالعموم ایسے مضامین ہم شائع نہیں کرتے ہیں۔ یہ ایک استثنائی صورت ہے۔

(ادارہ)

پاکستان کا وجود اس لیے عمل میں آیا کہ مسلمانانِ برصغیر ایک ایسا خطہ چاہتے تھے جہاں وہ اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کو اپنا کر گذاریں۔ اسی لیے اُس وقت یہ نعرہ عام طور پر سُنا جاتا تھا کہ۔ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" مگر افسوس کہ پاکستان کو وجود میں آئے تقریباً ایک تہائی صدی بیت گئی، لیکن "ہنوز روزِ اوّل" والا معاملہ ہے۔ ہم ابھی تک زبانی دعوؤں کی

منزل سے گذر کر عمل کے میدان میں قدم نہ رکھ سکے۔ وجوہات اور اسباب کی تلاش کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ایک تہائی صدی کے اس طویل عرصے میں پاکستان کے سیاسی افق پر بہت سی حکومتیں طلوع اور غروب ہوئیں۔ ہر حکومت اپنی بقا کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف رہی اور شاید اسی لیے اُن کو اتنا وقت نہ مل سکا کہ وہ حصولِ پاکستان کے بنیادی مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔ اتنے طویل عرصے میں آنے والی حکومتوں میں موجودہ حکومت اس لیے انفرادیت کی حامل ہے کہ اس کے سربراہ نے روزِ اوّل ہی سے قوم سے اسلام کے نفاذ کا وعدہ کیا اور اس کے ایفا کی کچھ کوششیں بھی کیں۔

اسلام کا نفاذ صرف ضابطوں یا قوانین کے تحت نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان بچوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ اسلامی تعلیمات سے روشناسی صرف اسی طرح ممکن ہو سکتی ہے کہ نصابِ تعلیم میں اسلامی تعلیمات کو لازمی مضمون کی حیثیت سے متعارف کرایا جائے تاکہ ہر طالب علم خواہی نخواہی اس مضمون کو پڑھنے پر آمادہ ہو۔

حال ہی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اعلان کیا تھا کہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ایک پرچہ ڈگری کی سطح پر اور ایک پرچہ ایم اے، ایم۔ ایس۔ سی کی سطح پر لازمی ہو گا۔ اس اعلان کو سن کر یہ اُمید بندھی تھی کہ ڈگری اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں اس مضمون کو لازمی مضمون کی حیثیت دینے سے صدرِ پاکستان کے نفاذِ اسلام کے وعدے کی تکمیل میں مدد ملے گی مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" ابھی اس اعلان کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ اس سلسلے میں قواعد پر نظر ثانی کی گئی اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں اس مضمون کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔

پتہ نہیں کہ وہ کون سا خفیہ ہاتھ ہے جو نہیں چاہتا کہ پاکستان کے حصول میں جو اسباب و مقاصد کارفرما تھے، اُن کی کسی طرح تکمیل ہو سکے۔ اس خفیہ ہاتھ کی مذموم کارفرمائیاں درج ذیل حقائق سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہیں۔

۱ —— ایک تہائی صدی گذرنے کے باوجود پاکستان میں اس کی قومی زبان ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں کر سکی، جس کی وہ حامل ہے جب کہ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں جو کہ ہمارے ساتھ ہی آزاد ہوا تھا، ہندی کو عملاً سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔

۲۔۔۔ مزید ستم یہ کہ ابھی حال میں اعلان کیا گیا کہ اردو جس کو لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہے اس میں علاقائی زبانیں بھی شامل ہوں گی۔ گویا قومی زبان کی اہمیت آدھی رہ گئی۔

۳۔۔۔ کراچی کے اعلیٰ ثانوی بورڈ نے کالجوں میں اختیاری مضامین کی جو فہرست دی ہے اُس میں اکنامکس، سوکس وغیرہ کے مدمقابل تو کوئی مضمون نہیں لیکن اسلامیات کو چار مضامین کے ایک گروپ میں شامل کیا گیا جس میں سے صرف ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ مضامین اسلامیات تاریخِ اسلام، تاریخ عمومی اور نفسیات ہیں۔

۴۔۔۔ تقریباً تمام کالجوں میں سے عربی کو بطور اختیاری مضمون ختم کر دیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مسلمان بچے اسلام کے بنیادی ماخذوں سے براہِ راست استفادہ نہ کر سکیں۔

اس خفیہ ہاتھ کی نشاندہی اربابِ اقتدار اور ملک و ملت کا درد رکھنے والے دانشوروں کے ذمے ہے۔ اسلامی تعلیمات پر مبنی جو نام نہاد مضمون یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے لازمی قرار دیا ہے، اس میں پاس ہونا تو ضروری ہے لیکن وہ مجموعی نمبروں میں شامل نہیں ہوں گے اور اسی لیے اس کے نمبر ڈویژن پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ محکمہ تعلیم کے ماہرینِ نصاب کی اس منطق کی داد بھلا کون دے سکتا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔۔۔ بی۔اے، بی۔ایس۔سی وغیرہ ڈگری کلاسوں میں مطالعہ اسلام اور مطالعۂ پاکستان ایک لازمی مضمون ہوگا جس میں کامیابی حاصل کیے بغیر ڈگری کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔

۲۔۔۔ مطالعۂ اسلام اور مطالعۂ پاکستان دونوں کی حیثیت مساوی ہو گی۔ گویا سو نمبر کے پرچے میں پچاس نمبر مطالعۂ اسلام کے اور پچاس نمبر مطالعہ پاکستان کے ہوں گے۔

۳۔۔۔ مذکورہ پرچے کے نمبر طالب علم کے مجموعی نمبروں میں شامل نہیں ہوں گے۔ یعنی اس پرچے کے نمبروں میں کمی بیشی کسی طالب علم کی ڈویژن پر اثر انداز نہیں ہو گی۔

۴۔۔۔ مطالعۂ اسلام کی اہمیت تو یہ کہ پاس ہونے کے لیے صرف سترہ نمبر مطلوب ہوں گے، لیکن اس کا نصاب اس قدر طویل رکھا گیا ہے کہ اسے مکمل کرانے کے لیے پورے تعلیمی سال کی مدت بالکل ناکافی ہوگی۔ نصاب کی طوالت، نمبروں کی کمی اور امتحان کے نتیجے پر ان کی غیر مؤثر حیثیت کا نتیجہ لامحالہ یہ نکلے گا کہ طلبا میں اس مضمون سے بیزاری کا رجحان بڑھے گا۔

۵ ـــ لیکن اس کا سب سے بڑا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ پاکستان میں کراچی یونیورسٹی میں بیس سال سے ڈگری کلاسوں میں "اسلامی نظریہ حیات" کا جو پرچہ سَو نمبروں کا ہوتا ہے۔ نئی تعلیمی اسکیم کے بعد اسے ختم کر دیا گیا۔ گویا کہ اسلامیات کے نام سے پچاس نمبروں کا ایک نصف پرچہ دیا گیا اور سَو نمبروں کے پورے پرچے سے طلباء کو محروم کر دیا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ محکمہ تعلیم کے ماہرین تعلیم نے صدر مملکت کے حکم کی تعمیل میں کس حسنِ ذوق کا ثبوت دیا ہے اور کیسی بے مثال منطق کا مظاہرہ فرمایا۔

۶ ـــ اسی طرح اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں ایم اے کی کلاسوں میں اسلامی تعلیمات کا سَو نمبروں کا ایک پرچہ لازمی ہے، لیکن نئی تعلیمی اسکیم کے نفاذ کے بعد یہ لازمی نہیں رہے گا۔ اور اس کے بجائے ڈگری کلاسوں میں پچاس نمبروں کے نصف پرچے پر اکتفا کرنی پڑے گی۔

۷ ـــ اس مضمون کا استاد ہونے کی حیثیت سے میرا کئی برسوں کا یہ مشاہدہ ہے کہ چونکہ اس پرچے میں زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے کے بعد بھی ڈویژن پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے طلباء اس مضمون کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور نہ حاضری کی پروا کرتے ہیں۔ پاس ہونے بھر کے نمبر کسی نہ کسی طرح حاصل ہو ہی جاتے ہیں۔ پہلے عام طور پر اس مضمون کی کلاس میں حاضری دس فی صد ہوتی تھی۔ اب اس اوسط حاضری کی بھی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ پاس ہونے کے لیے سترہ نمبر مطلوب ہوں گے اور وہ کسی نہ کسی طرح حاصل کر ہی لیں گے۔

مذکورہ بالا حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ طلباء اس مضمون کو سنجیدگی سے نہیں پڑھتے۔ اس امر کی طرف اُن کی زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کرانے کی خاطر یہ مطالبہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ:-

۱ ـــ اسلامی تعلیمات پر مبنی ایک پرچہ جس طرح ڈگری کلاسوں میں لازمی کیا گیا ہے اسی طرح ایم۔ اے وغیرہ کی کلاسوں میں بھی لازمی کیا جائے۔

۲ ـــ اسلامی تعلیمات کے پرچے کو سَو نمبروں کا ایک مستقل پرچہ رکھا جائے اور اس کے نمبروں اور وقت میں کوئی اور پرچہ شامل نہ کیا جائے۔

۳ ـــ مطالعۂ پاکستان کے پرچے کو سیاسیات یا تاریخ کے ساتھ شامل نہ کیا جائے۔

(باقی بر صفحہ ۴۸)

خدا ساتھ ہے

جناب نعیم صدیقی صاحب

خدا پر ایمان لانا اور اُس ایمان کے مطابق زندگی بسر کرنا، اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور اس کی وجہ سے پیش آنے والی مخالفتوں کو انگیز کرنا آسان کام نہیں۔ آدمی کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے قرآن اور حدیث میں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں کام کرنے والے بندوں کے ساتھ ہے اور اُن کو کشمکش کی حالت ...... میں ڈال کر اُن سے الگ نہیں ہو جاتا اور کہیں دور نہیں چلا جاتا، بلکہ اُن کی ساری سرگرمیوں میں اُن کا ساتھی ہوتا ہے، اُن کے احوال کو بچشم خود دیکھتا ہے، اور اُس کے فرشتے بھی اُن کے اِرد گرد سے اور اُن کے اوپر سے سایہ افگن رہتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کو دعوتِ حق کا جو جواب قوم کی طرف سے ملا وہ بجائے خود غم انگیز تھا، اور پھر وقتاً فوقتاً جو جھڑپیں کی جاتی تھیں وہ اذیت کو بڑھا دیتی تھیں، اور آخر کار جب عذابِ طوفان کا مرحلہ قریب آگیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے خشکی پر کشتی بنانی شروع کی تو قوم کا تمسخر بڑھ گیا اور حضرت نوح علیہ السلام کے دل میں چاروں طرف سے نشتر چبھنے لگے۔ اِس حالت میں اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ فرمایا کہ ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ بلکہ یہ بھی فرمایا کہ بِاَعْیُنِنَا یعنی ہماری آنکھوں کے سامنے بناؤ، دوسرے لفظوں میں یہ محسوس کرو کہ ہم خود اس سارے کام کو دیکھ رہے ہیں۔ (ہود ۳۷۔ مومنون ۲۷)

یہی اندازِ بیان حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کے متعلق ملتا ہے۔ جبکہ اُن کو فرعون کی طرف دعوت پہنچانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔ اِس پر دونوں حضرات نے اندیشہ ظاہر کیا۔ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں وہ ہمارے ساتھ

زیادتی نہ کرے یا کہیں بپھر کر بالکل لوٹ ہی نہ پڑے۔ جواب دیا گیا لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی۔ یعنی ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں دیکھتا سنتا ہوا۔ یعنی کہیں دُور بیٹھا ہوا نہیں ہوں۔ تمہارے ساتھ ساتھ ہوں اور سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں۔

پھر یہی انداز گفتگو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی قرآن میں ہے۔ فرمایا: وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا۔ یعنی مشکل حالات اور مخالفتوں کے بالمقابل خدا کے حکم پر مضبوطی سے جمے رہو، جب کہ تم بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔ یہ کلمہ خدا کی طرف سے بڑا حرفِ تسلی ہے کہ ہم محض تمہارے حالات کو جانتے ہی نہیں بلکہ براہِ راست نگرانی کر رہے ہیں۔ (الطور ۴۸)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ خدا ہر کام میں اور ہر مجلس میں بندوں کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ مجالس نجوٰی (خفیہ مجلسوں) کے متعلق فرمایا کہ:

مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا (مجادلہ ۷)

نجوٰی کرنے والے جب کبھی اکٹھے ہوتے ہیں تو اگر وہ تین ہوں تو چوتھا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ اور پانچ ہوں تو چھٹا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ اور (اسی طرح) اس سے زیادہ ہوں یا کم، وہ اُن کے ساتھ ہوتا ہے، خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔

دوسرے پہلو سے یہ فرمایا:

وَمَا تَکُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُھُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ (یونس ۶۱)

اے نبیؐ! تم کسی بھی سرگرمی میں ہو، یا قرآن پڑھ کر سنا رہے ہوتے ہو، اور اسی طرح (اے مومنو!) تم کوئی سے عمل میں بھی مصروف ہوتے ہو تو ہم نگران یا گواہ ہوتے ہیں (یا حاضر و ناظر ہوتے ہیں)

اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کام بھی کیا جائے، خصوصاً خدا کی راہ میں، خدا کے دین کے لیے جو خدمت

بھی انجام دی جائے، خدا اپنے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے اور ان کی سرگرمیوں کا عینی گواہ ہوتا ہے۔ بات محض فرشتوں کی رپورٹوں تک محدود نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ براہِ راست دلچسپی لیتا ہے۔

مسلم کی مشہور روایت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ:-

"جب کوئی گروہ (یا جماعت) خدا کے گھر (یا کسی مجلس ذکر و فکر) میں کتاب اللہ کو پڑھتی ہے اور اس کے درس و تدریس میں مصروف ہوتی ہے تو اُس پر خدا کی طرف سے سکینت نازل ہوتی ہے، خدا کی رحمت اُس پر چھا جاتی ہے، فرشتے اُس کو گھیر لیتے ہیں اور اللہ ایسی مجلس کا ذکر ان فرشتوں میں کرتا ہے جو اس کی بارگاہ میں ہوتے ہیں۔"

اس حدیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کو پڑھنا پڑھانا یا اُس کے مطالب پر فکر و کاوش کرنا یا اُس پر عمل پیرا ہونے کی تدبیریں سوچنا یہ ایسی باتیں ہیں کہ جس مجلس یا ادارے میں ہو رہی ہوں، اُس پر خدا کی رحمت ہوتی ہے، اس پر سکینت نازل ہوتی ہے اور فرشتے چاروں طرف سے آ کر اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ پسندیدگی کی وجہ سے ایسے کسی بھی حلقے کا ذکر فرشتوں میں کرتا ہے کہ دیکھو، میرے بندے مفاد و معاش کو چھوڑ کر صرف میری کتاب اور میرے ذکر کے لیے جمع ہیں۔

یہ حدیث بڑا حوصلہ دلاتی ہے۔ وہ چند افراد جو ایک خراب ماحول میں خدا اور اس کی کتاب اور اس کے دین کے لیے وقت نکال کر جمع ہوتے ہیں اور پھر دل سے دوسرے خیالات کو الگ کر کے خدا کے کام کی فکر کرتے ہیں وہ بے وقعت نہیں ہوتے، بلکہ خدا تعالیٰ اُن سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ اور اُس کے فرشتے اُن کے اردگرد جمع ہوتے ہیں۔

مسلم میں حضرت ابوہریرہ کی روایت کہ وہ ایک اور حدیث اسی مفہوم پر روشنی ڈالتی ہے۔ حضور نے فرمایا: کہ دن اور رات میں فرشتے باری باری تمہارے پاس آتے ہیں، جو فرشتے رات کے

وقت تمہارے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ (ملاء اعلیٰ کی طرف) واپس جاتے ہیں۔ اور پروردگار ان سے اپنے (ایماندار) بندوں کے متعلق پوچھتا ہے کہ تم نے انہیں کس حال میں چھوڑا ——— حالانکہ وہ خود زیادہ بہتر جانتا ہے ——— فرشتے کہتے ہیں کہ اس وقت وہ نماز میں تھے۔ اور جب ہم گئے تھے تو اس وقت بھی انہیں عالتِ نماز میں دیکھا تھا۔

دوسری روایات کی مدد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام انسانی آبادیوں میں فرشتوں کے گروہوں کی ڈیوٹیاں لگتی ہیں۔ ایک ڈیوٹی رات کی ہوتی ہے جس کے لیے نمازِ عصر کے وقت فرشتے آجاتے ہیں اور نمازِ صبح کے وقت واپس جاتے ہیں، اس وقت نئے گروہ دن کی ڈیوٹی سنبھال لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے اپنے بندوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال نہیں کرتا بلکہ اُن کی گواہی لے کر اُن کے سامنے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے کہ جب تم ڈیوٹی پر گئے تو بھی میرے ایماندار بندے نماز میں تھے۔ اور جب تم واپس آئے تو بھی نماز میں تھے۔ دُنیا کی مصروفیات اور آرام اور تفریحات کو چھوڑ کر بندوں کا نماز کے لیے حاضری دینا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

اس سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ محض فرشتوں کے ذریعے ہی بندوں کے اعمال کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ خود دیکھتا سُنتا ہے اور اُن کی دینی مشغولیتوں اور سرگرمیوں سے دلچسپی لیتا ہے۔

آخر میں ایک حدیث اور!

یہ حدیث قدسی بھی حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ ہے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ قَسَمْتُ الصَّلٰوۃَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْن۔ میں نے نماز کو اپنے بندوں اور اپنے درمیان آدھوں آدھ بانٹ لیا ہے۔ اور میرے بندے کے لیے وہ کچھ ہے جس کا اُس نے سوال کیا۔ بندہ جب کہتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ پھر وہ جب اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثناء

بیان کی اور جب بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو خدا فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری عظمت بیان کی۔ پھر بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو خدا فرماتا ہے کہ یہ بات میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے۔ یعنی اس میں ایک طرح کا عہد و پیمان ہے۔ مگر اس میں خدائے واحد کی عبادت کرنے کے لیے خدا سے استعانت بھی چاہی گئی ہے۔ لہٰذا ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندے نے جس مقصد کے لیے سوال کیا وہ اُسے عطا کیا گیا۔ پھر جب بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہاں سارا حصہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کو وہ کچھ حاصل ہوا جس کے لیے اُس نے سوال کیا۔

اس حدیث سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ نماز بندے اور خدا کے درمیان ایک ایسا رابطہ ہے جس میں بندہ خدا سے کلام کرتا ہے اور خدا کی طرف سے اس کے کلام پر جواب ملتا ہے۔ یہ جواب ہم اگر ظاہری کانوں سے سن نہیں سکتے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے سے تو یہ جان سکتے ہیں کہ اس طرح ایک ایک کلمہ پر خدا کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے۔

نماز کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان جس طرح تقسیم کیا ہے، اس کا نمونہ سورۃ فاتحہ کو سامنے رکھ کر دیا گیا ہے۔ یہی حالت ساری نماز کی ہے۔ سورۃ فاتحہ کی تقسیم حدیث کے مطابق یوں ہوتی ہے کہ اَلْحَمْدُ سے لے کر يَوْمِ الدِّيْنِ تک کے کلمات اللہ کی شان بیان کرتے ہیں لہٰذا یہ حصہ اللہ کے لیے ہوا۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ خدا اور بندے کے درمیان مشترک ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ سے لے کر الضَّآلِّيْنَ تک کی پوری دعا کا ماحصل بندے کے لیے ہے۔

یہ تصور کتنا ہمت افزا ہے کہ خدا تعالیٰ نماز کے دوران میں ہمارے کلمات کا ایک ایک کر کے خود جواب دیتا ہے اور ہم سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔

بندوں سے خدا کے ربط کا جو تصور اسلام نے دلایا ہے اس سے ایمان کی راہ میں کام کرنے والوں کی ہمت بلند ہوتی ہے اور وہ مشکلات اور مزاحمتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مضبوط جذبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

رسائل و مسائل

بعض شرعی قوانینِ حرمت پر سوالات

جناب نعیم صدیقی صاحب

سوال

۱۔ کیا شریعت اسلامیہ کی رُو سے کسی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو ____ شراب نوشی سے نہیں روکا جاسکتا، نیز کیا اُن کا حق ہے کہ انہیں شراب کشید کرنے، اُسے درآمد برآمد کرنے اور اس کا ذخیرہ کرنے، اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے اور بیچنے اور خریدنے کی اجازتِ عام حاصل ہو؟

۲۔ کیا لفظ ' اجتناب ' لفظِ حرمت کو ظاہر نہیں کرتا؟ اگر اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی تو پھر جوئے کو بھی دائرۂ حرمت سے نکالنا ہوگا۔

۳۔ کیا "سدومیت" (SADOMY) کو حرام قرار دینے والا کوئی لفظ قرآن میں ہے؟

۴۔ کیا جس خمر سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے وہ صرف انگور سے بنتی ہے اور بقیہ تمام اقسام حکمِ اجتناب کی زد سے بھی باہر ہیں۔

۵۔ کیا ایک اسلامی ریاست کے کسی ایسے قاضی کو مسندِ قضاء کے نااہل قرار دینے کے لیے عدالتی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے جو شریعتِ اسلامیہ کے مسلّمہ احکامِ حلّت و حرمت کو مسخ کرے؟

جواب

پہلے یہ امر ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ قرآن محض ایک ایسا ملفوظی ضابطہ نہیں ہے جو لیکا یک کسی غار کی کھدائی کے دوران میں ہاتھ لگ گیا ہو اور اس کی اصطلاحات اور اس کے طریقِ استدلال اور

اس کے احکامِ حلال و حرام کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس لغت اور گرامر اور اپنی ذہنی کاوشوں کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ الفاظِ قانون (LETTERS OF THE LAW) کے ساتھ ایک عظیم المرتبہ رسول کو بھیجا گیا اور اسی کے ذریعے یہ قانون ملّتِ اسلامیہ کو عطا ہوا جس کی ڈیوٹی قرآن میں صاف طور پر یہ بتائی گئی ہے کہ وہ قرآن کے منشاء کو واضح کرے اور اس کی تعمیل کرنے کا عملی نمونہ مہیا کرے۔ اُس رسولِ برحق کی دعوت سے ایک جماعت نمودار ہوئی۔ ایک تحریک برپا ہوئی۔ پھر نظامِ حق کی عملی تشکیل ہوئی۔ اور اس کے روز مرہ معاملات پر خدا کے رسولؐ نے آیاتِ الٰہی کو چسپاں کر کے امت کو تربیت دی کہ کہاں کس لفظ کا منشا کیا ہے، کس آیت سے کیا مراد ہے اور کن چیزوں کو منع کیا گیا ہے اور کن کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اب کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے ہیں جو قرآن کو اُس رسولؐ اور اس کی برپا کردہ تحریک اور اُس کے قائم کردہ نظام اور اُس کی قولی و عملی تشریحات سے کاٹ کر الگ کر لینا چاہتے ہیں اور پھر قرآن کے اندر سے قوانین اور اصطلاحات کو لے کر ان کو اُسی طرح تختۂ مشق بنانا چاہتے ہیں جیسے کہ کسی غار سے اچانک ایک قدیم دستاویز مل گئی ہو یا کسی پہاڑ کی چوٹی پر کسی چٹان کے پھٹنے سے ایک طومار برآمد ہو گیا ہو۔ چنانچہ اب رجم اور شراب نوشی وغیرہ کے متعلق نئے نئے انکشافاتی احکام سامنے آ رہے ہیں۔ شراب کی حرمت کے متعلق روزِ اول سے آج تک پوری اُمّت میں کبھی کوئی اختلافِ رائے نہیں ہوا۔

اب میں ترتیب وار سوالات کے جواب عرض کرتا ہوں:

۱ —— اصولی طور پر میں علامہ یوسف القرضاوی کی تحقیق سے متفق ہوں کہ اسلام کا ضابطۂ حلال و حرام پوری انسانیت کے لیے ہے۔ اور جب اسلامی ریاست قتل اور چوری اور زنا اور سود خواری کو جرمِ عام قرار دے گی تو شراب نوشی اور شراب سازی اور شراب فروشی کو بھی پوری مملکت کے تمام شہریوں کے لیے حرام ٹھہرائے گی۔ ان احکام کی نوعیت کسی گروہ کے شخصی قانون (PERSONAL LAW) کی نہیں ہے، بلکہ یہ قوانینِ عامۂ مملکت (LAW OF THE LAND) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ استدلال کہ شراب کا استعمال بعض گروہوں کے ہاں مذہبی اہمیت رکھتا ہے، اس بنا پر قابلِ قبول نہیں ہے کہ جو شے ناپاک شیطانی کام (رجسٌ من عمل الشیطٰن) کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے

استعمال کے مضرات صرف وقتی ہی نہیں ہوتے بلکہ معاشرے کی فلاح و بہبود پر دور تک مسلسل اثر انداز ہوتے ہیں ۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے ہندوؤں میں ستی کی جو رسم پائی جاتی تھی ۔ یا بعض قوموں اور قبیلوں میں مذہبی رواج ہے کہ اندھیرے میں بستی کے زن و مرد جمع ہو کر جنسی اباحتِ عام سے حظ اندوز ہوتے ہیں ۔ یا یہودیوں کے ہاں (غیر یہودی) انسانی خون کا جو پُر تقدس مذہبی استعمال ہوتا رہا ہے ، ان ساری صورتوں کو جائز قرار دے دیا جائے ۔

غیر مسلموں کے لیے اقلیتی حقوق کی بنیادوں پر شراب کے جواز کی راہیں کھولنے کا جو تجربہ ہمیں اپنی تاریخ کے عباسی دور میں پیش آیا ہے ۔ وہ حد درجہ تباہ کن ثابت ہوا ہے ۔ طبری اور الاغانی کے علاوہ فلپ حتی نے بھی ایسے ثقافتی اڈوں کا ذکر کیا ہے ۔ جن میں شراب و شاہد کا انتظام ہوتا تھا اور انہیں زیادہ تر یہودی عیسائی (اور مجوسی) چلاتے تھے ۔ کوفہ میں ایک ایسا عشرت کدہ ابن رامین کا خاص کی مشہور مغنیہ سلامۃ الزرقاء تھی ۔ ان اڈوں پر مسلمان نوجوان ، خصوصاً اس دور کے دانشور یعنی شعراء ادباء جمع ہو کر عیش و عشرت ہوتے اور پھر اسی رندانہ ثقافت کے گن گاتے ۔ ان اڈوں کو ذہین مسلم نوجوانوں کے اخلاق کی تباہی کے لیے اسی طرح استعمال کیا گیا ، جس طرح موجودہ دور کے یہودی غیر یہودیوں میں زہریلے منشیات کو عام کرنے میں مصروف ہیں[1] ۔ یہ یہودی ہی تھے جنہوں نے امریکہ میں قانونِ امتناعِ شراب کو ناکام کر دیا ۔

آج اگر ہم غیر مسلموں کو شراب نوشی اور شراب فروشی کی اجازت دے دیں تو یہ مسلمانوں کی اخلاقی تباہی کے لیے ایک مشن کے تحت اپنے اڈوں سے کام کریں گے ۔

پھر سوال یہ ہے کہ جب دنیا کی مختلف بندرگاہوں اور ہوائی جہازوں سے پاکستان کی اقلیتوں کے لیے شراب آ رہی ہو گی یا دنیا میں جا رہی ہو گی تو دنیائے اسلام اور دنیائے کفر میں یہی تو کہا جائے گا کہ پاکستان شراب امپورٹ یا ایکسپورٹ کرتا ہے ۔ علاوہ ازیں شراب کی نقل و حمل کے لیے ہمارے معاشرے

---

[1] دس بارہ سال پیشتر کے شاہی ایران میں ایک پاکستانی مسلم نوجوان کا گذر کسی یہودی کی چھوٹی سی سگریٹوں وغیرہ کی دکان پر ہوا ۔ باتوں باتوں میں اس یہودی نے بڑے بھاری کمیشن کی پیش کش کرتے ہوئے کہا کہ تم ہمارا مال (منشیات) پاکستان میں لگواؤ ۔

کی ریلیں اور ٹرک استعمال ہوں گے اور جگہ جگہ شراب کے پارسلوں کا اندراج ہوگا۔ کسٹم اور سیلز ٹیکس کے لیے اُن کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس کے بعد شراب سے وہ نفرت تو باقی نہیں رہ سکتی جو حرام ماکولات و مشروبات کے لیے اسلام ودیعت کرتا ہے اور نفس کے لیے ایک بڑی روک ہی ایمانی نفرت ہوتی ہے۔

شراب کے جو اثرات دُنیا میں ٹریفک کے حادثات، ازدواجی بگاڑ، جرائم، بہیمانہ تشدد، خودکشی، پاگل پن، نیم پاگل پن اور دیگر امراض کی صورت میں اب تک ظاہر ہو چکے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے ہم اپنے ہاں کی کسی آبادی کو کیسے اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے معاشرے میں اِن برائیوں کو پھیلانے کے لیے خصوصی حق حاصل کرے۔ اور پھر شراب نوشی آدمی کو جس تنزیہ میں مبتلا کرتی ہے وہ خیانت و بدعنوانی کی رفتار میں اضافہ کرتی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ محض لفظوں کی چیر پھاڑ سے اُوپر کے عرض کردہ مفاسد کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ بس کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اقلیتوں کے لیے فراخدل ثابت کرنے کی خاطر اکثریت کو سزا و خرابیوں کا شکار بننے کے لیے چھوڑ دیں۔

قرآن آج کل کے قانون دانوں کے ذوق کے مطابق خالص کتاب قانون نہیں ہے۔ جس میں دفعہ وار ضابطہ بندی (CODIFICATION) کی گئی ہو اور ہر ایکٹ کے شروع میں عنوان درج ہو، پھر اصطلاحات اور اُن کے مفہوم کو معین کیا گیا ہو۔ یعنی باقاعدہ کسی دفعہ یا دفعات میں صراحت و وضاحت ہو کہ جب لفظِ حرام استعمال ہوگا تو معنی یہ ہوں گے۔ اور جب کوئی دوسرا طریق متع وہی استعمال ہوگا تو اُس کے معنی وہ ہوں گے۔

قرآن سب سے پہلے ایک دین کی دعوت اور اُس کے لیے اُٹھائی جانے والی تحریک (بلکہ مختلف زمانوں کی تحریکوں) کی روئیداد بھی ہے۔ اساسی حقائقِ کائنات و حیات کا آئینہ دار ایک صحیفہ بھی ہے جس میں مخالف خیالات کا توڑ کر کے محکم دلائل سے کچھ عقائد کو پیش کیا گیا ہے، وہ کتاب اخلاق بھی ہے اور اخلاقی ضابطے بتانے سے زیادہ انسان کے اندر خدا پرستانہ اخلاقی ذمہ داری کا حاسّہ بیدار کرنے کی محرک ہے، وہ خدا پرستی اور دُنیا پرستی کی کشمکش کی پچھلی تاریخ کا خلاصہ بھی اپنے اندر رکھتی ہے، اور ان ساری چیزوں کے ساتھ ساتھ اُس میں نازل شدہ قوانین اور اُن کے

اجزا سے پیدا ہونے والے مسائل کا ذکر بھی ہے۔ یہ سب کچھ قرآن میں ملا جلا بیان ہوا ہے اور کبھی اعتقادی امور پر کلام قانونی حکم سے ملا ہوا ہے، کبھی قانونی حکم کے ساتھ اخلاقی تلقین شامل ہے اور کبھی ماضی کے کسی واقعے کے بیان کے ساتھ حلال و حرام کی کوئی تصریح کی گئی ہے۔ کوئی مقام ایسا نہیں جہاں حرام، مکروہ، مکروہ تحریمی، حلال، مباح اور پسندیدہ وغیرہ اصطلاحات کی لسٹ دے کر ان کے فروق بیان کیے گئے ہوں اور نہ کوئی یکجائی بیان ایسا ہے جس کے متعین قانونی الفاظ سے معلوم ہو جائے کہ مکمل حرمت و امتناع کے لیے لفظ حرام یا مصدر تحریم کے علاوہ اور کون کون سے الفاظ اور انداز بیان مترادف ہیں۔ یہ تو مفسرین و فقہاء کی محنتیں ہیں کہ انہوں نے ــــــ قرآن کے منہیات کو مختلف آیات سے لے کر سامنے رکھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات کی روشنی میں تعین کیا کہ حرام قرار دینے کے لیے کس کس طرح کے الفاظ اور اسلوب نہی قرآن نے اختیار کیے ہیں۔

مثلاً جن چیزوں کو لفظ حرام (یا اس مادے کے دوسرے مشتقات) سے ممنوع قرار دیا گیا ہے وہ حسب ذیل مقامات پر مذکور ہیں:۔

۱۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ (البقرہ ۔ ۱۷۳ ۔ تھوڑے سے مختلف الفاظ میں۔ المائدہ ۳، الانعام ۱۴۵ اور النحل ۱۱۵ ۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۳ میں یہ اضافہ ہے:۔ ۱۔ وَمَا اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ۔ ۲۔ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ۳۔ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ[1]

۲۔ لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (المائدہ ۔ ۹۵)

یہاں حرمت کا حکم محض کلمۂ نہی "لا" سے دیا گیا ہے اور اس کے بعد سزا یا کفارہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ ساری بات کر چکنے کے بعد پھر دہراتے ہوئے فرمایا کہ حرم علیکم صَيْدُ الْبَرِّ مَا

---

[1] یہاں آگے کے الفاظ ہیں ذٰلِكُمْ فِسْقٌ یعنی پانسوں سے تقسیم کردہ گوشت (یا دوسرے مال) کو حرام کرنے کی وجہ یہ بتائی کہ یہ تمہارے لیے فسق یا گناہ ہے۔ اس سے یہ اشارہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حرام کے لیے فسق یا فاسق کے لیے حرام کے الفاظ کا متبادل استعمال ہو سکتا ہے۔

دُمْتُمْ حُرُمًا (المائدہ: ۹۶)

یہاں لفظ حُرم کے ساتھ صرف "صید البر" کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ پہلے حکم ممانعت میں محض "صید" کا عمومی ذکر ہے۔ پھر وہاں کفارہ کا بیان بھی کر دیا گیا ہے۔ التباس نہ ہونے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ دونوں باتیں ایک ہی سلسلۂ کلام کا حصہ ہیں۔ دوسری یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہی کے دائرہ میں تعین فرمانے کے لیے موجود تھے کسی کو مغالطہ نہیں ہوا۔

المائدہ ۱ میں بھی یہ ممانعت موجود ہے۔

۳۔ حَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرہ: ۲۷۵)

۴۔ الانعام میں حرمتوں کا ایک تفصیلی بیان ہے۔ فرمایا: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (آیت ۱۵۱)

اس کے بعد حسب ذیل اُمور کو گنا گیا ہے:

ا۔ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (حرمت کا حکم حرف نہی "لا" سے)

ب۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔

اب اگر کوئی شخص کہے کہ قرآن کو قرآن سے سمجھنا اور اس کے الفاظ کو ضابطے کی طرح لینا ہے تو ظاہر بات ہے کہ ایسا آدمی یہی نتیجہ نکالے گا کہ والدین سے حُسنِ سلوک کو نعوذ باللہ حرام کر دیا گیا ہے۔ مثبت تقاضا بیان کر کے امر منہی عنہ کو محذوف کر دیا ہے۔

ج۔ وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ خَشْيَةِ اِمْلَاقٍ

د۔ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (یہاں حکم ممانعت لاتقربوا سے دیا گیا ہے)

ر۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔

س۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ (یہاں پھر لَا تَقْرَبُوا سے نہی کی گئی ہے)۔

ص۔ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ۔

یہاں پھر وہی اسلوب ہے کہ امر مطلوب کو بیان کیا جا رہا ہے اور اس کے مخالف جس چیز کو ممنوع

ٹھیرانا مطلوب ہے اُسے محذوف کر دیا گیا ہے۔

ط۔ وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا ۔ یہاں پھر مثبت اور اُس کی متضاد صورت جسے حرام کیا جارہا ہے، محذوف ہے۔

ع۔ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ أَوْفُوا ۔ یہاں بھی وہی صورت ہے۔

۵۔ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ۔ (النور ۔ ۳) یہاں حکم یہ ہے کہ مشرک یا زانی مرد یا مشرکہ یا زانی عورت سے ویسے ہی مرد و زن نکاح کر سکتے ہیں۔ مومنوں کے لیے یہ ممنوع ہے۔

۶۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ ..... الخ (النساء ۲۳)

اِن مثالوں کو سامنے رکھنے کے بعد حرمت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے قرآن کے چند اور مواقع پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

پہلی مثال:۔ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (المائدہ ۷۲)
یہاں حرّم کے معنی واضح ہیں کہ مشرکین کے لیے جنت ممنوع الدخول ہے۔

دوسری مثال:۔ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ (القصص ۔ ۱۲) یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق بتایا گیا کہ ولادت کے فوراً بعد جب وہ قصرِ فرعون میں پہنچے تو انہوں نے کسی بھی دایہ کا دودھ نہ پیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کر دینے کا مطلب ہے کہ ہم نے بحکمِ خاص حضرت موسیٰؑ کو اس سے روک دیا کہ وہ کسی دایہ کا دودھ پئیں۔

تیسری مثال:۔ وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۔ یعنی جن بھی بستیوں یا قوموں کو ہلاک کیا گیا۔ اُن کے لیے (خواہ اُن کے اعمال کی وجہ سے) بُرائی کی راہ سے پیچھے پلٹنے کا راستہ بند ہو چکا تھا۔

چوتھی مثال:۔ قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ (المائدہ ۔ ۲۶) یعنی بنی اسرائیل کو فتح کے ذریعے اُن کے انکارِ جہاد کی وجہ سے چالیس برس کے لیے ناممکن بنا دیا گیا۔ یہ مطلب نہیں کہ اُن کو حکم دیا گیا کہ خبردار اِدھر کا رخ نہ کرنا۔ اُدھر جانا حرام ہے۔

پانچویں مثال:۔ قَالُوا إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ (الاعراف ۔ ۵۰) اہلِ دوزخ

جنت والوں سے پانی مانگیں گے تو اُدھر سے جواب ملے گا کہ یہ تو کفار کے لیے ممنوع الاستعمال ہے۔

اِن ساری مثالوں سے حرمت کا جو تصور اُبھرتا ہے وہ ممنوعیت کا ہے۔ کوئی چیز منع ہے یا کسی چیز سے روک دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے اور الفاظ یا اسالیب نہیں ہو سکتے جو ممنوعیت کا مفہوم دیتے ہوں؟ جواب یہ ہے کہ قرآن میں شدید قسم کے احکامِ امتناعی کی ایسی مثالیں موجود ہیں جس کے لیے حرمت کے مادے کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اختصار کے لیے میں صرف ایک مثال دوں گا۔

سورۃ الحجرات میں تین باتوں کی ممانعت کی گئی۔ ۱۔ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۲۔ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ۔ ۳۔ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ (آیت ۱، ۲)[1]

اتنی بات سامنے ہو تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ تو ایک عام اخلاقی سفارش ہے۔ مگر اس کلام کا آئندہ جملہ یہ ہے کہ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۔ یعنی اگر تم خدا اور رسول کی بارگاہ میں حدادب سے تجاوز اختیار کرو گے، اگر تم خدا کے رسول کی آواز کے بالمقابل اپنی آواز کو بلند تر کرو گے اور اسی طرح تنک تنک کر بات کرو گے جیسے ایک دوسرے کے ساتھ کرتے ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے سارے اعمالِ حسنہ اکارت جائیں گے اور (چونکہ حبطِ اعمال کی کارروائی کو تم دیکھ نہیں سکتے لہٰذا) تمہیں خبر بھی نہ ہوگی۔ حبطِ اعمال کی وعید نے بتا دیا کہ مذکرہ ممنوعات کی شدت کس درجے کی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ شدتِ امتناع کے لیے قرآن کے پاس لفظِ حرمت کے علاوہ بھی سرمایۂ الفاظ و اصطلاحات ہے۔

---

[1] اسی حرفِ نہی کے استعمال کی ایک اور اہم مثال یہ ہے کہ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ (یٰسٓ ۶۰) اور عبادتِ شیطان کی وضاحت دوسرے امتناعی حکم سے ہوتی ہے کہ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (النور، ۲۱)۔ پھر لَا تَتَّخِذُوْا، لَا تَقْرَبُوْا، لَا تَقْتُلُوْا، لَا تَعَاوَنُوْا، لَا تَاْكُلُوْا، وغیرہ بے شمار افعال کا ذکر بصورتِ نہی کیا گیا ہے۔ ان ساری مثالوں کو یہاں جمع نہیں کیا جا سکتا۔

بے شک آپ نے سوال میں شراب کے لیے اجتناب کے جس حکم (فَاجْتَنِبُوْا) کا ذکر کیا ہے، وہ بھی امتناع اور حرمت کے معنی دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے احکام ممانعت متعدد ہیں۔

۱۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۳۶)

۲۔ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج۔ ۳۰)

۳۔ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (الحج۔ ۳۰)

۴۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات ۱۲)

۵۔ جملہ شرطیہ کی صورت میں اجتناب کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ اِنْ تَجْتَنِبُوْا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیّاٰتکم (۳۱)[1]

طاغوت، بتوں کی گندگی، قولِ زور اور کثرتِ ظن سے اگر قرآن نے روکا ہے تو دوسرے لفظوں میں ان ممنوعات کو حرام کیا ہے۔ بات محض نظری ناپسندیدگی کی نہیں کہ خیر اگر آپ طاغوت سے بھی دل لگالیں تو کیا حرج، اور بت پرستی کی گندگی میں بھی آلودہ ہوجائیں تو کوئی خاص بات نہیں۔ جھوٹی گواہی دیتے رہیں تو بھی بس یونہی ذرا سرسری سی کمزوری ہے یا اسی طرح لوگوں کے متعلق کثرت سے بدگمانیاں کرتے رہیں تو بھی کوئی ایسا پیچیدہ معاملہ نہیں ہے۔ جی نہیں یہ سب کچھ حرام ہے۔ اسی طرح کبائر اثم کے متعلق کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُن کا معاملہ حرام سے کم درجے کا ہے۔ ہاں صرف "ظن" کا ایک معاملہ ایسا ہے کہ چونکہ اس کا تعلق قلب و ذہن سے ہے اس وجہ سے یہ شاید قانونی موضوع نہ بن سکے۔ مگر باقی سارے افعال حرام ہیں، جرم ہیں اور اُن پر مناسب سزا ہوسکتی ہے۔

یہی الفاظ شراب کی ممانعت کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ مگر اس کلمۂ نہی کے ساتھ اور اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ بلید الذہن آدمی ہی یہ سوچ سکتا ہے کہ شراب درجۂ اوّل کی منہیات میں سے نہیں ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ "رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ" ہے، یعنی گندا شیطانی فعل۔ پھر یہ کہ اس سے شیطان کا مقصد تمہارے درمیان عداوت و بغضاء پیدا کرنا ہے اور نماز اور ذکر سے روکنا ہے۔ پھر جلالت بھرے انداز میں

---

[1] یہاں کبائر اثم کے متعلق اللہ نے خود ما تنھون کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کبائر کا ارتکاب حرام ہے۔ لہٰذا محض اللہ کی طرف سے منع کر دینا بھی حرمت کے ہم معنی ہے۔

کہا گیا ہے کہ "پھر کیا تم باز نہیں آؤ گے ؟" اس نہی استفہامی کا زور قرآن پڑھنے والا آدمی ہی جان سکتا ہے۔ چنانچہ جس مجلس میں یہ تازہ نازل شدہ کلام سنایا جا رہا تھا۔ اس کے حاضرین با آواز بلند پکار اٹھے کہ اے رب ہم باز آ گئے! پھر یہ واقعہ بھی شراب نوشی کی شناعت کو واضح کر دے گا کہ امتناعی حکم کی منادی سن کر بعض اصحاب نے ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے الگ کر کے پھینک دیئے اور مٹکے گلیوں میں انڈیل دیئے۔

شراب نوشی کے جرم پر حضورؐ اور جمیع خلفائے راشدین کے دور میں حد جاری کی گئی۔ ریکارڈ میں لفظ حد ہی ملے گا، تعزیر نہیں۔ بعدہٗ پوری اُمت میں بلا اختلاف اس بات پر اجماع رہا ہے کہ شراب حرام ہے، اس کا پینا پلانا یا اس کا بنانا اور خریدنا بیچنا سب حرام ہیں۔ بلکہ حضورؐ نے ایسے برتنوں کا استعمال بھی منع کرا دیا جو مے نوشی کے لیے مخصوص سٹائل رکھتے ہوئے۔ آج یکایک اگر اس متفقہ اجماعی فیصلے کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی ذہن ایسا ہے جو نہ تو قرآن ہی کو کماحقہ سمجھنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ (محض چند آیات کے چند ٹکڑے سامنے رکھ لیے گئے ہیں) نہ سنت کا احترام کرتا ہے اور نہ پوری امت کے اجماع کو وقعت دیتا ہے۔ ایسے شخص کے نادر چٹکلے کیا پہاڑوں کے پتھروں پر نافذ ہوں گے؟ کیا ایک معاشرے کے معتقدات اور قانونی مسلمات کے علی الرغم زبردستی کوئی نئی چیز اس پر ٹھونسی رہ سکتی ہے؟ ظاہر بات ہے کہ اس قسم کی کوششیں جڑ ہی نہیں رکھتیں، ورنہ خوارج کی بھی تو حکومت قائم ہوئی تھی، اُن کے مخصوص طور طریقے اُمت میں باقی رہ جانے چاہئیں تھے۔ اُمت کے اساسی اور مجموعی ذہن سے ٹکرانے والی حکومتیں اور عدالتیں کبھی چل نہیں سکتیں۔ دیکھتے دیکھتے تلپٹ ہو جاتی ہیں۔

مستفسر سے گذارش ہے کہ شراب کے متعلق جو استدلال کیا گیا ہے، اسی کو جوئے پر بھی منطبق کر لیں۔ خمر، میسر اور ازلام تینوں رجس من عمل الشیطان ہیں۔ تینوں میں مشترک قسم کے مفاسد موجود ہیں۔ تینوں کے لیے "اجتنبوا" کے لفظ سے ہی شدید کی گئی ہے اور تینوں کے آخر

---

[1] دُبّا، حنتم، نقیر، مزفّت کی ممانعت کے لیے وہ گفتگو سامنے رہے جو ۸ھ میں حضورؐ نے وفدِ بنی عبدالقیس کے سامنے کی۔

میں ہے کہ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ؟ اور سننے والوں نے اس کا جواب دیا تھا: قَدِ انْتَهَيْنَا يَا رَبِّ ! پس یہ حرام قطعی ہیں اور قانوناً جرم ہوں گے اور ان پر سزا جاری ہوگی۔

ایک اور مقام استدلال بھی ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب بلند کے متعلق قرآن مجید میں جو چند جملے اکٹھے کیے گئے ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (الاعراف - ۱۵۷) یعنی حضورؐ بالفاظ قرآن (یا بہ نطقِ خود) طیب اور پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور خبیث اور گندی چیزوں کو حرام ٹھیراتے ہیں۔ یہاں حِلّت و حرمت کا ایک ایسا معیار بیان ہوگیا کہ جس کی مدد سے قرآن و حدیث کے مجازات و ممنوعات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور جزئی اُمور میں اگر اجتہاد کرنا پڑے تو اجتہاد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ کام حریف و مدعی کا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ شراب خبیث چیزوں میں سے نہیں بلکہ طیبات میں سے ہے یا اُن سے کم تر کسی درجے میں ہے۔

یہ بھی سامنے رہے کہ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو واضح فرمایا ہے کہ الحلال بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ یعنی حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی۔ وَبَيْنَ ذٰلِكَ اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ۔ اور ان دونوں کے درمیان کچھ اشتباہی امور ہیں۔ جن کے متعلق اکثر لوگ یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ حلال ہیں یا حرام۔ حضورؐ کی تعلیم یہ تھی کہ جس نے بر بنائے احتیاط اپنے دین و عزت کو بچانے کے لیے اُن سے اجتناب کیا وہ بچ نکلا اور جو کوئی اس دائرے کی کسی چیز کی لپیٹ میں آگیا، اس کے لیے بعید نہیں کہ وہ حرام تک جا پہنچے۔ مثال دی کہ جیسے کسی محفوظ چراگاہ (یا کھیت) کے کنارے پر چرنے والے جانوروں سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ چراگاہ یا کھیت میں جا گھسیں۔

اب دریافت طلب یہ ہے کہ آیا شراب ایسے مشتبہات میں سے ہے کہ انسانوں کی اکثریت یہ سوچتی رہ جائے کہ نہ معلوم یہ طیبات میں سے ہے یا خبائث میں سے اور یہ ممنوع ہے یا ناجائز یا بالفاظِ دیگر حرام ہے یا حلال؟ کیا دنیا بھر کے مذہبی نوشتے، شراب کے متعلق عقلی و تجربی بحثیں اور اس کے اثراتِ بد کا عالمی ریکارڈ اس قسم کے شبہ کی گنجائش چھوڑتا ہے؟

اور حضورؐ کی قائم کردہ (نمونہ کی) سوسائٹی کا اس سے اجتناب کرنا، امتناعی حکم ملتے ہی مے نوشی بند کر دینا اور متعلقہ برتن توڑ دینا اور شراب نوشوں کو کوڑے لگانا، کیا یہ سب کچھ دریا برد کر کے

سوچا جائے گا۔

تبوک سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر وفد ثقیف حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وفد کے لوگوں نے بعض امور میں بطور خاص استثنیٰ چاہا۔ ان امور میں سے ایک شراب نوشی کی اجازت حاصل کرنا بھی تھی۔ حضورؐ نے یہ اجازت نہیں دی۔ ذرا خیال فرمایئے کہ ابھی اسلام پوری طرح پھیلا بھی نہیں تھا۔ اور ثقیف والوں کی بڑی تعداد اس سے آزاد تھی، اس کے باوجود اُن کو یہ معلوم تھا کہ دین محمدؐ میں شراب ممنوع ہے۔ اگر حرام نہ ہوتی تو حضورؐ ڈھیل دے سکتے تھے۔

بہت سی ثقہ روایات کو چھوڑ کر میں ایک ایسا واقعہ لیتا ہوں جسے تاریخ کے ذریعے بچہ بچہ جانتا ہے۔ ابو محجن ثقفی ۹ھ میں اسلام لائے، بہادر، جانباز تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو عراق میں لشکر میں بھیجا۔ پھر معرکہ جسر میں رسالے کی قیادت کی۔ پھر بویب کے معرکے میں داد شجاعت دی۔ اسلام سے پہلے طائف کے تاکستانوں نے ثقفیوں میں شراب نوشی کی وبا پھیلا رکھی تھی۔ اسلام کے غلبے کے بعد بھی انگوروں کا رس بعض طبائع کو بہکاتا تھا۔ روایت یہی ہے کہ ابو محجن کو شراب کی لت تھی، ایک بار پکڑے گئے، حضرت عمرؓ نے کوڑے لگوائے، پھر گرفتار ہونے پر اور سزا ہوئی۔ لیکن جب جرم اور سزا میں یہ کشمکش لمبی ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے ان کو جزیرہ حضوضہ میں نظر بند کر دیا۔ یہیں وہ واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے جب معرکہ قادسیہ کا حال سنا تو بے قرار ہو گئے۔ اُس وقت جو اشعار ابو محجن نے کہے اُن میں سے ایک یہ تھا ؎

كفى حزنًا ان تردى الخيل بالقنا   واترك مشدودًا علىّ وثاقيا

(اس سے بڑھ کر دکھ کیا ہوگا کہ سوار نیزے لیے جنگ میں شریک ہو رہے ہیں اور میں یہاں زنجیروں میں جکڑا ہوا پڑا ہوں)۔

آخری شعر ہے ؎

وَلِلّٰهِ عَهْدٌ وَ لَا اخون بعهده   لئن فرجت ان لا ازور الحوانيا

(میں نے بارگاہ الٰہی میں عہد کیا ہے اور اس عہد میں خیانت نہیں کروں گا کہ اب اگر مے خانے کے دروازے مجھ پر چوپٹ کھول دیئے جائیں تو بھی میں ادھر کا رُخ نہیں کروں گا)۔

ان دردناک اشعار میں چھپے جذبے کا اثر یہ ہوا کہ سپہ سالار سعد بن ابی وقاص کی اہلیہ (سلمیٰ)

یا اُن کی اُم ولد زبرا نے اس وعدے پر اُن کی زنجیریں کھول کر سواری کا گھوڑا بھی دیا کہ شام کو وہ واپس آکر پھر زنجیریں پہن لیں گے۔ انہوں نے شجاعت اور ایفائے عہد کا ایسا نمونہ دکھایا کہ سعد بن وقاص بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ رات کو گھر آنے پر ابو محجن کا حال معلوم ہوا تو انہیں آزاد کر کے فرمایا کہ تم جیسے جانباز کو میں قید میں نہیں رکھتا۔ ابو محجن نے جواب دیا کہ اب میں بھی شراب کے قریب نہ جاؤں گا۔

قصے کی مزید تفاصیل سے قطع نظر شراب کی حرمت اور شراب نوشی کے قابلِ سزا جرم ہونے کی بدیہی شہادت موجود ہے اور پھر اس سے بڑی شہادت کیا ہوگی کہ سیدنا عمر فاروق نے اپنے فرزند کو شراب نوشی کی ایسی سزا دی کہ آج بھی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

۳ ——— گناہ ہم جنسی یا سدومیت (SADOMY) کی کوئی سزا واضح طور پر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے بلکہ جو لوگ رسولؐ کی تبیینِ قرآن سے آزاد ہو کر خالص قرآنی قانون تک ذہن کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ تو یہی کہیں گے کہ یہ حرام نہیں ہے۔ کم تر درجے کی بُرائی ہے۔ اور وہ بھی صرف ازواج کی حد تک۔ لیکن شریعت کا شعور رکھنے والے اذہان فوراً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس جرم کی شناعت عام زنا سے بھی زیادہ ہے۔ اگر رسولِ خدا کی سنّت اور صحابہؓ کی سوسائٹی کے عملی نمونوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو قومِ لُوط کے احوال کے بیان کے علاوہ کوئی براہِ راست ممانعت سدومیت کی نہ ملے گی۔ براہِ راست ایک ممانعت اشارۃً ہے تو وہ ازواج سے وطی فی الدبر کے لیے ہے۔

ایسی ہی مثالوں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ "قرآن مع رسولؐ" ہی سے پوری ہدایت مل سکتی ہے جو باہم دگر لازم و ملزوم ہیں۔

۴ ——— خمر کے مفہوم کو انگوری شراب تک محدود اور امتناع کو اس کے لیے مخصوص رکھنا انہی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو رسولؐ سے قرآن کو منقطع کر سکے لیں۔ حضورؐ نے حسبِ ذیل صراحتیں فرمائی ہیں:

——— حضورؐ سے ان شرابوں کے متعلق سوال کیا گیا جو شہد یا جَو وغیرہ سے بنائی جاتی تھیں، جواب میں فرمایا: کُلُّ مُسکِرٍ خمرٌ وکُلّ خمرٍ حرام (مسلم) ہر نشہ دار چیز خمر ہے اور ہر خمر حرام ہے۔ گویا قرآن میں جو لفظ خمر استعمال ہوا ہے، اُس کے جامع اصطلاحی مفہوم کو آپؐ نے متعین

فرما دیا۔

اگر کوئی شخص اسے نہ ملنے تو اُسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ انگور کے علاوہ دیگر اجناس سے بننے والی شرابوں میں نشہ نہیں ہوتا۔ اور اُن سے وہ مفاسد نہیں پیدا ہوتے جن کا ذکر ممانعتِ شراب کی آیت میں ہے؟

—— دوسری توضیح یہ فرمائی کہ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام (احمد، ابوداؤد، ترمذی) یعنی جس چیز کی کثیر مقدار نشہ دیتی ہو اُس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔

—— شراب سازی، شراب کی تجارت اور نقل وحمل سب کو منع فرمایا۔ حدیث ہے کہ۔

لعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشرۃ: عاصرھا ومعتصرھا ای طالب عصرھا، وشاربھا وحاملھا والمحمولۃ الیہ وساقیھا وبائعھا واکل ثمنھا، والمشتری لھا والمشتراۃ لہ - شراب بنانے والے اور بنوانے والے، لے جانے والے بلوانے، خریدنے اور بیچنے والے اور دیگر متعلقہ فریقوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا۔

—— ایک شخص نے خمر کے متعلق سوال کیا تو حضورؐ نے اسے اُس کے استعمال سے منع فرمایا۔ اُس شخص نے کہا کہ میں اسے دوا کے طور پر بناتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا "اِنَّہٗ لَیْسَ بِدَوَاءٍ وَّلٰکِنَّہٗ دَاءٌ" (یہ دوا نہیں، بیماری ہے)۔ (مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی) اس سلسلے میں ابن مسعود کا روایت کردہ یہ ارشاد ہم تک پہنچا کہ اللہ نے جن چیزوں کو تمہارے لیے حرام کیا ہے اُن میں شفا نہیں رکھی (بخاری، تعلیقاً)

اگر کسی شخص کا نقطۂ نظر یہ ہو کہ قرآن کا ایک لفظ لے کر توضیحاتِ رسولؐ اور احکامِ رسولؐ سے بالکل رُوگردانی کرکے اس کا مفہوم متعین کرنا ہے تو پھر سارے قرآن کو بالکل الٹا جا سکتا ہے۔

قرآن اور حدیث کے قوانینِ حرمت کو سامنے رکھ کر فقہاء نے ایک قاعدہ کلیہ بنایا ہے، جس کی صحت کو عقلِ سلیم رکھنے والا ہر شخص بلا تامل محسوس کرلے گا کہ "ما ادّی الی الحرام فھو حرام" جو چیز حرام تک پہنچانے یا حرام میں مبتلا کرنے کی باعث بنے وہ بھی حرام ہے۔ اس قاعدہ کے مطابق قرآن ہی میں بے شمار احکام ہیں، مثلاً پردے کا سارا نظام زنا کو روکنے کے لیے ہے۔ شریعت کو جس چیز سے روکنا ہوتا ہے وہ صرف اسی سے منع نہیں کرتی، بلکہ اُس کے ذرائع اور محرکات و مؤیدات کا سدِباب کرنے کے لیے فصیلیں بناتی ہے، باڑیں لگاتی ہے۔ اب جن لوگوں کو نظامِ شریعت کی ساخت ہی کا علم نہ ہو وہ کسی آیت یا کسی آیت کے کسی لفظ کو لے کر جو معنی چاہیں اس پر لاد سکتے ہیں۔

۵ ـــــ اب آپ کے آخری سوال کی باری ہے، جو بڑا بھاری سوال ہے۔

دین یا شریعت یا فقہ کے نظام کا تعلق کسی معاشرے یا اُمت سے ہوتا ہے۔ اس کی عمومی اکثریت ایک خاص طرح کے عقائد رکھتی ہے۔ دین کا ایک تصور اس میں کارفرما ہوتا ہے۔ شریعت یا قانون و فقہ کا ایک نظام صدیوں سے اس میں نشوونما پاتا ہے۔ کسی قوم کے درمیان فیصلہ کرنے والے جج کا یہ منصب نہیں کہ وہ عامۃ الناس کے دینی اور شرعی مسلّمات کو توڑ کر فیصلے کرنے لگے۔ یوں بھی شریعت میں "معروف" اور جدید قوانین میں "رسم و رواج" کو قانونی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لوگوں پر لوگوں کی مرضی کے خلاف فیصلے ٹھونسنے سے پہلے کسی "مصلح" آدمی کو جج کی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے لوگوں میں اپنے نئے نقطۂ نظر کی دعوت پھیلانے اور عوام کو تعلیم دینے کا کام کرنا چاہیے۔ پھر اگر وہ اپنے کسی نقطۂ نظر کے لیے فضا کو تیار کرلے اور رائے عام اس کے ساتھ ہوجائے تو وہ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے کا موقع پائے تو ضرور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق فیصلہ کرے۔ منصب قضا اپنے عقاید، تصورات اور مزعومات کو ٹھونسنے کا نام نہیں، یہ تو مسلّمات کے مطابق فیصلے کرنے کا منصب ہے۔ جسے عامۃ الناس کے اساسی تصور دین و شریعت یا قانونی و اخلاقی مسلّمات سے اختلاف ہو، وہ کوئی دوسری خدمت انجام دے۔

یہاں تو وہ قوم بستی ہے جس نے پاکستان کی تحریک اس لیے چلائی کہ وہ کتاب و سنّت کے مطابق زندگی کی تشکیل نو چاہتی تھی۔ پھر اس نے دستوری طور پر یہ بات ثبت کرائی کہ تمام قوانین اور فیصلے کتاب و سنّت کے مطابق ہوں گے۔ ایسی صورت میں اگر کوئی قاضی مسند قضاء پر بیٹھ کر کتاب کو سنّت سے الگ کرکے لیتا ہے اور سنت کو ذریعۂ توضیح قرآن نہیں مانتا تو پہلے اسے قوم کو اپنے نئے اور مختلف خیالات کا قائل بنانا چاہیے۔ ورنہ محکمہ عدلیہ کے دیے ہوئے اختیارات کو اگر قوم کی مرضی عام اور طے شدہ دستوری اصول کے خلاف وہ استعمال کرتا ہے تو یہ ایک ایسی کارروائی ہے جس کا نظام مروج میں کوئی راستہ موجود نہیں ہے۔

سنگسار کی سزا کا مسئلہ ہو یا شراب کی حرمت کی بحث۔ صحیح امر یہ ہے کہ اگر اتفاق سے کوئی غیر مسلم جج بھی کرسی پر بیٹھا ہو تو وہ فیصلہ عامۃ المسلمین کے مسلک کے مطابق دے۔ اور اگر کسی کا ضمیر اس پر راضی نہ ہو تو وہ کسی بھی ایسے معاملے کو ہاتھ میں لینے سے انکار کردے، جس کے متعلق وہ عامۃ المسلمین کے مسلّمات کے مطابق فیصلہ دینے پر تیار نہ ہو۔

اس کی ایک مثال انگریزی دور کی عدلیہ کی گذر چکی ہے۔ اس سامراجی قوت نے ہم کو غلام بنانے کے باوجود پرسنل لا کی حد تک ہماری شریعت اور ہماری فقہ میں مداخلت سے اجتناب کیا ہے۔ حتیٰ کہ پریوی کونسل تک نے کوئی ایسا فیصلہ دینے سے انکار کر دیا جس سے سنت تو کیا، ہدایہ اور عالمگیری میں درج شدہ ضابطے ...... ٹکراتے ہوں۔ آجکل بھارتی حکومت بار بار ایسے اقدامات کر رہی ہے۔ جن سے مسلمانوں کے پرسنل لا کو درہم برہم کرنا مطلوب ہے۔ اگر یہی روش ہمارے یہاں اختیار کر لی جائے تو پھر بھارت ہی نہیں، یورپ اور امریکہ و برطانیہ میں بھی مسلمانوں کے کسی دینی قاعدے قانون کا کوئی لحاظ باقی نہ رہے گا۔

یہ نازک مرحلہ جب کہ نفاذِ شریعت کا نعرہ گونج رہا ہے۔ اسلامی قانون کی تدوین کے لیے کونسل بیٹھی ہے۔ کچھ قوانین مدون ہو چکے ہیں، شرعی عدالتوں کا چرچا ہے۔ اور لوگ دم سادھے یہ دیکھ رہے ہیں کہ دیکھیں کیا ہونے والا ہے، اس وقت اگر قانونِ شریعت میں طرح طرح کے نئے شگوفے عدلیہ کی طرف سے چھوڑے جانے لگے تو عامۃ الناس کا اعتماد متزلزل ہو جائے گا۔

جی ہاں! آپ کے سوال کے آخری جزء کا جواب میں اثبات میں دیتا ہوں۔ اگر کسی جج کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے سنت سے انحراف کیا ہے یا اسے قانونی وقعت نہیں دی ہے تو یہ دستور کے متعین کردہ بنیادی اصول کی ایسی خلاف ورزی ہے کہ اس پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے —— چاہے پارلیمنٹ میں ہو، چاہے ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ کے سربراہ ججوں کے ایک بنچ کے سامنے، چاہے علماء کے کسی نمائندہ بورڈ کے سامنے اور چاہیں تو تدوینِ قانونِ اسلامی کی وفاقی کونسل کے سامنے۔ قانون ان میں سے کوئی بھی صورت طے کر سکتا ہے۔ پہلا قدم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاملہ یہاں تو عدالت کے سامنے لے جایا جا سکے۔

مطبوعات

ناشرین اور مصنفین جن کی کتابیں ہمارے ہاں آئی ہیں ان سے معذرت خواہ ہوں کہ ایک نہایت ہی ضروری چیز غیر ملکی پریس سے آئی ہوئی تھی اور اس کا معاملہ مہینوں سے چل رہا تھا۔ اس پر ریویو قدرے طویل ہونے کی وجہ سے اس بار بھی دوسری کتابوں کے لیے جگہ نہیں رہی۔ (ن۔ ص)

THE ISLAMIC REVOLATION IN IRAN

ناشر: دی مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن

حالیہ ایرانی انقلاب کے متعلق یہ چار لیکچروں کا مجموعہ ہے ـــــ جو HAMID ALGAR نے دیئے اور ساتھ ہی سوالات و جواب بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے کے مرتب ہمارے دوست جناب کلیم صدیقی صاحب (پاکستانی) ہیں۔

انقلاب ایران تاریخ رواں کا ایک اہم باب ہے اور پاکستان میں اسلامی ذہن کے لوگوں نے بڑی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ کیونکہ عالم اسلام میں کام کرنے والی مختلف تحریکوں کے لیے یہ باعثِ تقویت محسوس ہوا۔ مگر ایران والوں کو، خصوصاً صاحب خطبات اور متعلقہ شرکائے بحث کو یہاں کے اچھے ردِّ عمل کا علم نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے کہ کلیم صدیقی بہ حیثیت ایک پاکستانی کے اس کمی کو جس حد تک پورا کر سکتے تھے، انہوں نے نہیں کیا۔ ملک سے باہر رہ کر شاید وہ خود بھی حالات سے پوری طرح آگاہ نہ رہے ہوں۔

انقلابِ ایران پر یہ لیکچر بہت سی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اور کوئی بھی شخص جو اس موضوع پر کوئی کام کی چیز لکھنا چاہیے اُسے کتابوں اور مضامین کی فہرست بناتے ہوئے اس مجموعہ خطبات کو بھی سامنے

رکھ لینا چاہیے۔ صاحبِ خطاب کی اس مہارت کی داد دینی چاہیے کہ انہوں نے انقلاب ایران کی فلاسفی کا بہت اچھا لباس تیار کیا ہے اور زبان بھی ایسی ہے کہ بعض معمولی باتیں بھی اسرارِ حکیمانہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور شاید ہر انقلاب کو اس قسم کے لکھنے اور بولنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

انقلاب ایران کو پیش کرتے ہوئے عالمِ اسلام کی دوسری اسلامی تحریکات کے متعلق، جنہیں برادر تحریکیں بھی کہا گیا ہے، اندازِ گفتگو شاندار نہیں ہے۔ اُن کا ذکر کچھ مسترد کرنے کے سے انداز میں کیا گیا ہے۔ دو تنظیمیں بالخصوص زد میں آ رہی ہیں۔ ایک اخوان المسلمین، دوسری جماعتِ اسلامی (کالعدم) ہو سکتا ہے کہ انقلاب کے مرحلہ اوّل کی کامیابی کے لمحۂ نشاط میں کوئی اور نگاہوں میں نہ جچے۔ لیکن اسی مجموعے میں چند ایسے نکات بیان کیے گئے ہیں کہ اگر توجہ اُن پر پوری طرح رہتی تو سوچنے کا انداز دوسرا ہوتا۔ دراصل یہ تحریکات مختلف قافلے ہیں جو مختلف حالات کی وادیوں سے اپنے اپنے طریق پر گزر رہے ہیں اور سب کے لیے حامی اور مخالف عوامل کچھ یکساں بھی ہیں اور کچھ ایک دوسرے سے بالکل الگ بھی ہیں۔ ہر ایک کو اپنا کام اپنے طور پر کرنا ہے۔ حالات کسی کو موقع دیں تو وہ دوسروں سے آگے نکل سکتا ہے۔ اور کسی کے لیے زیادہ رکاوٹیں پیدا کر دیں تو تاخیر ہو سکتی ہے۔ ایک ہی منزل کے ان قافلوں کو جذبۂ یگانگت سے سوچنا چاہیے۔

جماعت اسلامی (کالعدم) کے متعلق ایک جگہ کہا گیا ہے کہ اسے جمہوری طریق کار پہ اصرار ہے۔ لیکن اس طریقِ کار سے وہ انقلاب کی تکمیل کو لازم نہیں سمجھتی تھی۔ انتخابات میں جانا، مقابلہ کرنا، سیٹیں حاصل کرنا یہ سب اثر اندازی کے لیے ہیں اور اثر اندازی کا عمل تو اس وقت بھی نتیجہ خیز ہوا جب کہ دستوریہ میں جماعت کا ایک بھی رکن نہ تھا۔ اور قراردادِ مقاصد اس مطالبے کے مطابق پاس ہوئی جسے مئی ۱۹۴۸ء میں مولانا مودودی مغفور نے اُٹھایا تھا۔ سیٹوں کی گنتی کرنے والا ذہن دوسرا ہے۔ کچھ اور لوگ ووٹوں کی کل تعداد کی گنتی کرتے ہیں۔ مگر جماعت اسلامی (کالعدم) کے اہلِ شعور یہ تصور رکھتے تھے کہ ہر کارروائی اور سرگرمی اپنی دعوت اور اثرات کو پھیلانے اور اسلام کے نظریاتی مخالفین کا مقابلہ کرنے کے لیے ہے —— ہر میدان اور ہر دائرے میں اس وقت تک کام ہوتے رہنا چاہیے جب تک کہ فطری طور پر انقلابی عمل واقع نہ ہو خود ایرانی انقلاب کے سامنے بھی تو دو مراحل ہیں:۔ ایک موجودہ دستوری ادارت کا دور اور ایک بعد کا اصلی دور

تحریک اسلامی پاکستان کے شعور کی نفی اس دعوے سے کی گئی ہے کہ مولینا مودودی مغفور سرسید کی مانند معذرت کیش (APPOLOGIST) تھے البس ذرا انداز نیا تھا۔

خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس مجموعے میں بہت سے ایسے موضوعات جمع ہیں جن سے بحث پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً تسلیم کیا گیا ہے کہ ایران پر شیعیت کے خلاف کبھی کوئی شعوری ردعمل پیدا نہیں ہوا یا مثلاً امامت اور خلافت کی بحث اور ان کے مراتب کا فرق، علماء کا ایرانی معاشرے میں تاریخی پارٹ اور انقلاب پر اس کا اثر، ولایت فقیہ اور مقام مجتہد اور منصب آیت اللہ کے فروق ''ایران کا نظام چلانے کے لیے ایک طرف سے طبقہ علماء اور دوسری طرف سے انتظامی مشینری کے ماہرین کی ضرورت۔ پھر ان دونوں قوتوں میں ذہنی بُعد اور اس سے پیدا ہونے والی کشاکش، انقلاب کے پس منظر میں شاہ کی طرف سے جدیدیت اور سیکولرازم کے نفاذ کے لیے جبریت، اراضی کا اعلیٰ اور بڑا حصہ شاہی تصرف میں رکھ کر کاشتکاروں کو سرکاری مزارعت کی سطح پر رکھنا۔ طے شدہ دستور سے انحراف کر کے علماء کو ان کے دستوری مرتبے سے محروم کرنا، صہیونیوں اور بہائیوں سے سازباز اور ملک میں ان کا نفوذ، ساواک کا تشدادی نظام، فری میسنری کے پھیلے ہوئے جال، امریکی افسروں اور ماہرین کا قانون سے بالاتر قرار دیا جانا، وغیرہ بہت سے ایسے وجوہ تھے جنہوں نے شاہ کے خلاف آہستہ آہستہ ردِّ عمل پیدا کیا۔ اور یہ لاوا تاریخ کے تالاب میں جمع ہوتا رہا۔ ایران کی خوش قسمتی ہے کہ اس تالاب کا بند توڑ کر سیلابِ انقلاب لانے والے لا محالہ امام خمینی کے تھے، ورنہ دوسری طاقتیں بھی تاک میں بیٹھی تھیں۔ انقلاب اسی طرح انقلاب بنتا ہے کہ عوام کے اضطرابات اور بیزاریوں کا لاوا مناسب حد تک جمع ہو جانے پر کوئی ہاتھ اُسے سیلاب میں بدلتا ہے۔ یہ موقع امام خمینی کو ملا۔ یہ اچھا ہوا کہ کسی اسلام دشمن نظریے کے علمبردار اس سے فائدہ اُٹھانے کے قابل نہ ہوئے۔

ایرانی انقلاب کی نوعیت یہ نہیں کہ کچھ لوگوں نے ملکی اور مغربی اور سوشلسٹ نظاموں کے خلاف تنقید کر کے زندگی کے مطلوبہ اسلامی نظام کا پہلے سے عوام کو شعور دلایا ہو، پھر اُن کو منظم کر کے اُن کی تربیت کی ہو۔ (جیسے کہ ایک سائل نے بحث میں تربیت کے مسئلے کو بڑی اہمیت

سے اُٹھایا ہے) اور بصیرت بدلتے حالات سے لڑ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کا راستہ بنایا ہو، اور آخر میں کوئی بہتر موقع پیدا ہونے پر انقلاب واقع ہوا ہو۔ بخلاف اس کے مختلف مسلم خطوں میں ایمان و شعور کے ساتھ بعض شخصیتیں ایسی اُٹھیں جنہوں نے اپنی تنہا ذات سے کام شروع کر کے ہزارہا افراد کا انقلابی قافلہ تیار کر دیا جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ قریباً تمام مسلم ممالک میں اور خصوصاً پاکستان میں علماء کی کوئی ایک ٹیم یا صف نہیں ہے بلکہ کئی حلقے اور گروہ ہیں جن میں تعاون کم اور معرکہ زیادہ ہوتا رہا ہے۔ فرقہ وارانہ اختلافات کے جنگل میں سے راستہ بنانے والوں کے کام کی نوعیت اور ہے، اور جہاں نظریۂ امامت اور نظام مجتہدین کے تحت ایک شیعی قوم کے علماء مجتمع چلے آ رہے ہوں، وہاں معاملہ دوسرا ہے۔ دلچسپ یہ ہے کہ انقلاب کے بعد وہاں کے علماء اور غیر علماء میں بھی اور خود مختلف مجتہدین میں بھی اختلافات نمودار ہو رہے ہیں، جو ہمارے لیے دلی طور پر سخت تکلیف دہ ہیں۔

اس مجموعہ خطبات کی تیاری تو مہدی بازرگان کے دور میں ہوئی۔ لیکن اب جو حالات سامنے ہیں، وہ ہمیں بہت پریشان کرتے ہیں۔ قوم کے منتخب صدر بنی صدر کے خلاف علماء میں ایک ہل چل موجود ہے۔ خود امام خمینی اور شریعت مداری میں اختلافات ہو چکے ہیں۔ اسی طرح طالقانی صاحب کے معاملہ میں بھی اُلجھنیں پیدا ہوئیں۔ دوسری طرف روس نواز اشتراکی گروپ بھی متحرک ہے۔ عوام کے معاشی مسائل ابھی حل طلب ہیں۔ اُوپر سے ایک لامتناہی جنگ کا سامنا ہے۔ ادھر مسلمان ممالک (خصوصاً عربوں) سے انقلابی ایران کے تعلقات صحت مندانہ نہیں ہیں۔ شروع میں انقلاب کو ایکسپورٹ کرنے اور مسلم ممالک کے عوام کو حکومتوں کے خلاف اُکسانے کی جو بات ایک مرتبہ واشگاف طور پر ہو گئی تھی۔ اس کے اثرات برقرار ہیں۔ حالانکہ ایک کامیاب انقلاب از خود دوسرے ملکوں کے عوام کو بھی سوچنے کی نئی راہیں سُجھاتا ہے۔ ضروری نہیں ہوتا کہ قائدینِ انقلاب دوسرے ملکوں کو اپنی زبان سے پکاریں۔ انقلابی سیاست کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ انقلابی عمل چونکہ جنگی عمل کے مشابہ ہوتا ہے لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ضرب ہدف کسی ایک طرف مرتکز کیا جائے اور بقیہ اطراف سے اگر دوستانہ ربط ممکن نہ ہو تو کم سے کم کسی طرح کی مخالفانہ اکساہٹ پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ اسی اصول کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے

ایران کے اکابر کو یہ تلخ حقیقت محسوس کرنی پڑی کہ ہم اکیلے رہ گئے ہیں۔

اس مجموعے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلم ممالک اور اسلامی تحریکوں نے ایرانی انقلاب کو تائید بہم نہیں پہنچائی۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک سے اسلامی ذہن کے لوگ ایک سے زیادہ بار مجتمعاً اور منفرداً ایران پہنچے اور اپنی طرف سے اچھے زوردار جذبات کا اظہار کیا۔ ان میں اخوان کے باا ثر حضرات بھی تھے اور کالعدم جماعت اسلامی کے بھی۔ حتیٰ کہ اس جماعت کے تو امیر میاں طفیل محمد بہ نفسِ نفیس حاضری دینے گئے۔ تائید کی، خوشی ظاہر کی اور اپنی طرف سے پیش کش کی کہ جس طرح کی مدد ہم سے درکار ہو، ہم حاضر ہیں۔ یہاں لاہور میں بھی جو حضرات اولاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور کی زندگی میں اُن سے ملے اور بعدازاں جتنے اصحاب منصورہ میں گئے، سب کا برادرانہ جذبات سے خیر مقدم کرنے کے علاوہ تائیدی روح کا مظاہرہ کیا گیا۔

مگر اس ستم ظریفی کا کیا علاج کہ عالمِ اسلام سے جانے والے لیڈروں کو عظیم مجموں اور شاندار تقریبوں کا تماشا تو دکھایا گیا، مگر اُن کے ساتھ بیٹھ کر نہ کسی نے اپنی مشکلات کا ذکر کیا، نہ کسی اہم مسئلے میں مشورہ لیا۔ آخر یک طرفہ ٹریفک پر اصرار کیوں؟

اس مجموعے میں شیعہ سنّی اتحاد پر بھی خاصی باتیں درج ہیں مگر اپنے دوست کلیم صدیقی صاحب سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ ذرا ذرا سے اختلافات پر اپنے قریبی لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکتے تو بڑے پیمانے پر ملّت کے اتحاد کے تذکروں سے کیا حاصل!

باتیں اس مجموعے میں بہت سی ہیں اور ہر بات بحث طلب ہے، مگر اپنے پاس وقت اور صفحات دونوں محدود ہیں۔ لہٰذا یہ ایک مجمل اور سرسری تبصرہ ہے۔ بدقسمتی سے میں نشان زدہ عبارتوں کے حوالے (صفحات نمبر) درج نہیں کر سکا۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ یہ مجموعہ اور ایک دوسری کتاب جو مجھ تک پہنچی ہے۔ انہیں لانے والا ادارہ اگر کسی انتظامِ خاص سے چل رہا ہے تو کوئی انہونی بات نہیں۔

لیکن اگر اسے محض چند افراد اپنے ذاتی مالیات اور احباب کے تعاون سے چلا رہے ہیں تو ایسے اصحاب کی قربانی قابلِ قدر ہے۔ مگر قابلِ قدر کے ساتھ جب میں امام خمینی کی سادہ زندگی

اور معاشرت کے متعلق پڑھی ہوئی عبارت کو ذہن میں لاتا ہوں (اور اس کے ساتھ متقابلاً بعض دوسرے اشخاص کے متعلق چبھتے ریمارکس) تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس شاندار پیرائے میں چھپا ہوا لٹریچر امام خمینی کے کسی محب کی طرف سے آئے تو مقام تعجب ہے اور اگر کسی دلیل سے اس کی استثنائی ضرورت ظاہر کی جائے تو پھر میں کہوں گا کہ دوسروں کے ہاں بھی استثنائی ضرورت پائی جاسکتی ہے۔

بہرحال میں یہ ضرور کہوں گا کہ ایران اور شیعیت، ایرانی انقلاب اور امام خمینی کے متعلق جو بھی اصحاب کچھ جاننا چاہتے ہوں وہ دوسری کتابوں اور مقالوں کے ساتھ ساتھ اس مجموعے کو بھی پڑھیں۔

اطلاع عام

جناب جہانتاب احمد صدیقی ولد مسنجاب احمد صدیقی سابق ملازم ماہنامہ ترجمان القرآن ۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ کو مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۸۱ء سے ادارہ سے سبکدوش کردیا گیا ہے۔ ان سے ادارہ کی طرف سے کسی قسم کے لین دین کی ذمہ داری ادارہ قبول نہیں کرے گا۔ اگر کسی نے ۱۵ر فروری ۱۹۸۱ء کے بعد ان سے ادارہ کی طرف سے لین دین کیا ہو تو ادارہ کو فوراً مطلع کریں۔

سید حسین فاروق مودودی

(بقیہ اشارات) بھی ہیں اور اشتراکیت و اسلام کے مرکبات ایجاد کرنے والے بھی۔ صوبہ واریت اور نسل پرستی کے مریض بھی اور طبقہ پرستی کے دیوانے بھی ــــ یہ مریض معاشرہ جسے وحدت کے تریاق کی ضرورت ہے۔ اس کے متعلق آپ نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ عہدِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سا معیارِ وحدت رکھنے والا معاشرہ ہے۔ یعنی ایک شئے جو مطلوب ہے، اسے آپ نے موجود فرض کر کے حکم لگا دیا ہے۔ پس اختلافِ احوال سے وہ فتویٰ غلط ہو گیا جو صحیح طور پر چسپاں نہیں ہو رہا۔ یہ بحث اپنی جگہ الگ ہے کہ اگر یہاں متذکرہ نقیضِ وحدت امور نہ ہوتے، تب بھی پارٹیوں کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے کچھ استدلال اُوپر آ گیا ہے جہاں ہم نے پارٹیوں کے کام کی ضرورت و اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اگر معاشرے میں اعتقادی و عملی وحدت موجود ہونے کی صورت میں متذکرہ فتویٰ دیا گیا ہوتا تو کم سے کم اس کی ایک بنیاد تو ہوتی۔

بقیہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور اسلامی تعلیمات

۴ ــــ مطالعۂ پاکستان کو انگریزی کے ساتھ، اس کے نمبروں میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

۵ ــــ طلباء میں اسلامی تعلیمات کا شوق پیدا کرنے اور اس مضمون میں بھی طلبا کی حاضری کو معمول پر لانے کے لیے ضروری ہے کہ اس پرچے میں نہ صرف پاس ہونا ضروری سمجھا جائے بلکہ اس کے نمبر مجموعی نمبروں میں شامل کیے جائیں اور ڈویژن بنانے کے لیے بھی اس کے نمبروں کا شمار لازمی قرار دیا جائے۔

اِدارۂ ترجمان القرآن کی نئی پیشکش

جناب محمد صلاح الدین صاحب مدیر "جسارت"

کے قلم سے

بُنیادی حقوق

پیش لفظ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

حرفِ آغاز

محمد صلاح الدین

○

کاغذ ولائتی — طباعت آفسٹ — کور خوبصورت

سائز ۲۲×۱۸/۸

○

قیمت: بیس روپے

○

اِدارۂ ترجمان القرآن، اِچھرہ، لاہور